میثاق

مدیر

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ [illegible]
سالانہ چھ روپے (پندرہ شلنگ)

میثاق

لاہور

جلد نمبر ۱۱ | رمضان ۱۳۸۴ھ | شمارہ نمبر ۱

فہرست مضامین

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ:-

منیجر ماہنامہ میثاق، رحمان پورہ، اچھرہ، لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کے لئے ترسیلِ زر کا پتہ:-

منیجر دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح

سرائے میر، اعظم گڑھ، یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ صدارتی انتخاب کا ہنگامہ بڑے اچھے نتائج پر ختم ہوا۔ صدر ایوب نہ صرف یہ کہ کامیاب ہوئے بلکہ بڑی واضح اکثریت سے کامیاب ہوئے اور اس کامیابی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس ملک میں پہلی مرتبہ چند ایسی مثالیں قائم کر دی ہیں جو امید ہے ہماری سیاسی زندگی میں آئندہ روایت کا درجہ حاصل کر لیں گی اور ان سے جمہوریت کے نصب العین کو بڑی تقویت حاصل ہوگی۔

34720

صدر ایوب پہلے شخص ہیں جو فی الواقع عوام کے ووٹ سے منتخب ہو کر اس ملک کے صدر بنے ہیں اس سے پہلے کوئی صاحب بھی یہ شرف حاصل کرنے کی ہمت نہ کر سکے تھے۔ صدر ایوب نے نہ صرف یہ کہ اس ملک میں پہلی مرتبہ عام انتخاب کرایا بلکہ نہایت واضح طور پر اپنے دستور، اپنی پالیسی، اپنے پروگرام بلکہ اپنی پوری زندگی کو لوگوں کے سامنے رکھ دیا اور ہر شخص کو کھلی چھٹی دے دی کہ جو شخص جس طرح اور جن لفظوں میں چاہے ان کی زندگی اور ان کی پالیسی اور پروگرام پر تنقید کرے۔ جو لوگ پچھلے چند مہینوں میں متحدہ محاذ کے لیڈروں اور اخباروں کی تحریریں، تقریریں اور بیانات پڑھتے رہے ہیں وہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ اس دوران میں جو کچھ صدر ایوب کے متعلق کہا گیا ہے، جو افواہیں ان کے متعلق پھیلائی گئی ہیں، نیز جو لب و لہجہ ان پر تنقید کا رہا ہے وہ ساری چیزیں نہایت صبر آزما تھیں جن کو ایک نہایت منجھا ہوا مضبوط سیاسی آدمی ہی برداشت کر سکتا تھا۔ صدر ایوب نے نہ صرف یہ کہ ان چیزوں کو برداشت کیا بلکہ ایسی رواداری اور بلند حوصلگی کے ساتھ برداشت کیا کہ یہ حقیقت

نہوں نے آفتاب کی طرح واضح کر دی کہ ہمارے لیڈر حضرات میں سے کوئی صاحب اس وصف
یں ان کے پاسنگ ہونے کا درجہ بھی نہیں رکھتے۔

پولنگ کے لئے جو قواعد و ضوابط اختیار کئے گئے وہ ہمارے ملک میں پہلی مرتبہ اختیار کئے گئے۔ ان قواعد و ضوابط نے ممکن حد تک دھاندلی اور دھونس کے امکانات کا سدباب کر دیا۔ انسانی کاموں میں جو احتیاط ممکن تھی وہ اختیار کی گئی۔ اگر اس کے باوجود اکا دکا کوئی واقعہ قابل اعتراض پیش آیا تو اس وجہ سے نہیں پیش آیا کہ اس کے پیش آنے کے لئے کوئی رخنہ قصداً کھلا چھوڑ دیا گیا تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ الیکشن کے کھیل میں ان رخنوں کے سدّباب کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ یہ نہیں گمان کرنا چاہئے کہ ان سے فائدہ کسی ایک ہی فریق نے اٹھایا ہوگا۔ بلکہ فریقین میں سے جس کا داؤں بھی جہاں چل گیا ہوگا وہاں اس نے اس سے فائدہ اٹھا لیا ہوگا۔ حکومت جو احتیاطیں کر سکتی تھی وہ اس نے کی ہیں۔ جن باتوں کا تعلق عوام کے شعور و احساس سے ہے ان میں اگر کوئی خرابی ظاہر ہوتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی ہمارے ہاں عام ووٹروں میں وہ شعور شہریت پختہ نہیں ہوا ہے جو جمہوری ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس راہ میں قدم آگے کی طرف بڑھا ہے یا پیچھے کی طرف ہٹا ہے۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ الیکشن کمیشن اور حکومت نے انتہائی کوشش اس بات کے لئے کی ہے کہ لوگوں کے لئے اپنے ووٹ آزادانہ استعمال کرنے کا موقع فراہم کیا جائے اور ووٹر اپنے ووٹ کی اخلاقی و سیاسی قدر و قیمت سمجھیں۔ عام انتخاب کے ساتھ ساتھ اس چیز کا تجربہ بھی ہمارے ملک نے بالکل پہلی بار کیا ہے اور یہ جمہوریت کے حق میں ایک نیک فال ہے۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو اقتدار پر ہو اس کو انتخاب کا معرکہ سر کرنے میں بڑی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اقتدار کے سبب سے جتنی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں، اس سے کئی گنا مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ امریکہ اور انگلستان جیسے ملکوں میں جہاں ہمہ جہت ترقی کی وجہ سے ترقی اور عزت کے حصول کی بے شمار راہیں کھلی ہوتی ہیں لوگ سرکاری مناصب کو بہت لالچ کی

نگاہوں سے نہیں دیکھتے ۔ وہاں کے حوصلہ مند کامیابی و ترقی کے دوسرے میدانوں میں اپنے ارمان پورے کر لیتے ہیں ۔ ہمارے پس ماندہ ممالک میں صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے ۔ یہاں حوصلہ مندوں کے لئے قسمت آزمائی کا ایک ہی میدان، اسمبلیوں ، وزارتوں اور صدارتوں کا ہے ۔ اس وجہ سے ہمارے ہاں کرسی نہایت محسود چیز بن گئی ہے ۔ جو شخص اقتدار حاصل کر لیتا ہے وہ تمام محرومین کا محسود بن جاتا ہے ۔ جس کے سبب سے اس کے ہنر بھی لوگوں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکنے لگتے ہیں ، اس کی ہجو اور بدگوئی کو لوگ شعار بنا لیتے ہیں ، اس کے عیوب گنانا ، اس کی تحقیر کرنا ، اس کو خائن ، ظالم ، بددیانت ثابت کرنا جرأت ، حق گوئی اور جمہوریت پسندی کی علامت خیال کیا جاتا ہے ۔ اور اس کی کسی نمایاں سے نمایاں خوبی کا بھی اگر کوئی راستباز آدمی اظہار کر دے تو بہت سے لوگ اس کو تملق ، خوشامد اور وظیفہ خواری پر محمول کرتے ہیں ۔ ایسے ماحول میں کسی کا اقتدار پر ہوتے ہوئے لوگوں کا ووٹ حاصل کرنا کوئی آسان بازی نہیں ہے ۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ایسے ماحول میں ان لوگوں کو زیادہ آسانی ہے جو اپوزیشن میں ہوں ، جو بے محابا تنقید اور بے تحاشا وعدے کر سکتے ہوں ۔ ایسے لوگ بڑی آسانی سے غازی بن جاتے ہیں اگرچہ گز بھر کی زبان کے سوا ان کے اندر کوئی بھی ہنر نہ ہو ۔ اسلامی نظام اور حکومت الٰہیہ قائم کر دینا بھی ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہوتا ہے اگرچہ بھول کر بھی کبھی ان کو پچھم طرف گرنے کی توفیق نہ ہوئی ہو ۔ اس کے برعکس کسی صاحب کرسی کے خلاف ہمارے ہاں لوگ بڑی آسانی کے ساتھ بے دلیل سے بے دلیل دعوے اور غلط سے غلط الزام قبول کر سکتے ہیں ۔ ایسے ماحول میں صدر ایوب نے اگر منصفانہ الیکشن کرا کے بھاری اکثریت سے فتح حاصل کی تو ہمارے نزدیک یہ ایک تاریخی بات ہوئی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو اس ملک میں کیسی عظیم مقبولیت حاصل ہے ۔ اگر صدر ایوب کی اس کامیابی کو بھی کچھ لوگ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں اور وہ انتخابات کو نامنصفانہ سمجھتے ہیں تو وہ جا کے کسی قبرستان میں الیکشن کرائیں تاکہ انہیں کسی مزاحمت سے سابقہ پیش نہ آئے ، سو فیصدی کامیابی انہی کی رہے ۔

صدر ایوب نے اب تک انتخابات کے سلسلہ میں جتنے وعدے کئے خدا کے فضل سے وہ وعدے پورے کرنے کی انہوں نے توفیق پائی ۔ اپوزیشن نے ہر قدم پر ان کے وعدوں کو

مشکوک ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اپنے عمل سے اپوزیشن کے پھیلائے ہوئے سارے شبہات بے بنیاد ثابت کر دیئے۔ ہمارے نزدیک کسی لیڈر کی ایک بہت بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ قول و قرار کا پکا ہو۔ ہمیں امید ہے کہ صدر ایوب قول و قرار کی یہی پختگی اپنے ان وعدوں کے معاملے میں بھی دکھائیں گے جو انہوں نے اس ملک میں اسلامی زندگی کے نشوونما اور خلافِ شریعت قوانین کی اصلاح سے متعلق کئے ہیں۔ یہ وعدے صرف اسی پہلو سے اہمیت نہیں رکھتے کہ دستور میں ان کا اقرار کیا گیا ہے یا صدر ایوب نے جگہ جگہ اپنی انتخابی تقریروں میں اُن کا حوالہ دیا ہے۔ ہمارے نزدیک تو اُن کی اصلی اہمیت اس پہلو سے ہے کہ صدر ایوب ماشاءاللہ خود ایک باحمیت مسلمان ہیں، ایک باحمیت مسلمان جبکہ وہ بااختیار بھی ہو کس طرح یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اس کے جانتے بوجھتے اس ملک میں ایسی باتیں آزادی سے ہوتی ہیں جو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف ہیں۔

صدر ایوب کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ یہاں اسلامی زندگی اور اسلامی تہذیب کے پیدا کرنے میں جو دخل ان کو حاصل ہو سکتا ہے وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ لوگوں کے بننے بگڑنے میں جتنا دخل لیڈروں کا ہوتا ہے کسی کا نہیں ہوتا مشہور ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکھم۔ لوگ اپنے حکمرانوں کے طریقے پر چلتے ہیں۔ صدر ایوب اگر یہاں اسلامی تہذیب و روایات کا احیا اور اسلامی احکام و قوانین کا اجرا چاہیں گے تو صبح و شام میں یہ چیزیں یہاں فروغ پا جائیں گی اور دیکھتے دیکھتے ہر چیز پھیل جائے گی۔ ہمارے ملک میں زبان سے اسلام اور اسلامی تہذیب و احکام کی تلقین کرنے والے بہت سے لیڈر آ چکے ہیں، ان کی باتوں سے کچھ بھی نہیں بنا بنایا اس لئے کہ لوگ کہی ہوئی باتوں پر نہیں چلتے بلکہ کئے ہوئے کاموں کی تقلید کرتے ہیں۔ صدر ایوب چونکہ ایک سپاہی آدمی ہیں اس وجہ سے ہم ان سے دوسرے لیڈروں کی نسبت بالکل مختلف طرز عمل کی اُمید رکھتے ہیں۔ یعنی یہ امید کرتے ہیں کہ وہ اسلامی زندگی خود اختیار کریں گے تاکہ ان کو دیکھ کر ان کے رفقاء بھی ان کی تقلید کریں اور پھر درجہ بدرجہ یہ برکت تمام عمال حکومت اور پھر عام لوگوں میں پھیلے۔ دنیا میں دینی احکام و قوانین سے نہیں بلکہ بڑوں کے عملی نمونوں ہی سے پھیلا کرتی ہیں۔ پھر قوانین کا اجرا و نفاذ بھی آسان ہو جاتا ہے اس لئے کہ فضا بدل جانے کی وجہ سے لوگ ان قوانین کا نہایت اچھی اسپرٹ سے خیر مقدم کرتے ہیں۔

صدر محترم نے منتخب ہونے کے بعد جو پہلی تقریر کی وہ ہمیں نہایت پسند آئی۔ اس تقریر ں اپوزیشن کے لئے انہوں نے جس رواداری بلکہ فیاضی کا اظہار کیا ہمیں ان سے اسی کی توقع ی۔ اب وہ ساری تلخیاں دلوں سے نکال دینے ہی میں خیر و برکت ہے جو بدقسمتی سے الیکشن ے دوران میں نہایت شدت کے ساتھ پیدا ہو گئیں۔ اس الیکشنی ہنگامہ کے متعلق ہماری ناچیز ئے تو یہ ہے کہ یا تو اس کو اسلامی حدود و قیود کا پابند کیا جائے اور اس کے لئے ضابطہ اخلاق تاب و سنت کی روشنی میں متعین کیا جائے یا لیڈر حضرات اپنے اور اپنی قوم کے اندر وہ سپرٹ یدا کریں جو کھلاڑیوں کے اندر ہوتی ہے اور جس کا مظاہرہ امریکہ اور برطانیہ کے لوگ اپنے ہاں انتخابات ے موقع پر کرتے ہیں۔ اس کے بغیر اگر یہ کھیل یونہی جاری رہے تو ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ شیطانی کھیل ن جائیں گے اور یہ جمہوریت ہمیں بڑی مہنگی پڑ جائے گی۔ ہمارے شہروں اور دیہاتوں میں مختلف سم کی گروہی، خاندانی، قبائلی، طبقاتی اور مذہبی رقابتیں پہلے سے موجود تھیں اور یہ سخت اصلاح ی محتاج تھیں لیکن ان کی اصلاح تو درکنار اس ہنگامہ انتخابات نے ان میں بڑا اضافہ کر دیا ہے۔ گاؤں گاؤں میں ایک نہایت افسوسناک قسم کی کشمکش پیدا ہو چکی ہے جس سے بہت سے مقامات یں نہایت ناگوار صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ کتنی عزیز جانیں انتخابی ادارہ کے انتخابات کے موقع پر ضائع ہوئیں اور اب صدر کے انتخاب کے بعد کراچی میں جو کچھ ہوا ہے اس پر جتنا بھی غم کیا جائے کم ہے۔ ذمہ داری کسی کی بھی ہو، لیکن ہمارے نزدیک تو اصل ذمہ داری حکومت کی ہے۔ پولنگ کے روز امن قائم رکھنے کے لئے جو مضبوط انتظام ہوا تھا اس سے بڑا اطمینان ہوا تھا کہ جذبات کے انتہائی ہیجان کے باوجود ملک کے کسی حصے میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی لیکن کراچی کے واقعہ سے وہ سارا اطمینان تشویش سے بدل گیا۔ ابھی صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات باقی ہیں جن میں انتقامی جذبات کے ابھرنے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ اندیشہ ہے کہ ان میں مقامی رقابتیں زیادہ شدت کے ساتھ ابھریں گی اس وجہ سے ان کے سدباب کے انتظامات سے حکومت کو غافل نہیں رہنا چاہیئے۔

اور یہ جو ہم نے کہا ہے کہ انتخابی سرگرمیوں کو اسلامی حدود و قیود کا پابند کیا جائے تو یہ:

یوں ہی نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سارا ہنگامہ شیطانی ہے۔ اسلام اس کے دس فیصد کا بھی روادار نہیں ہے۔ ہم تو اس کے متعلق مرزا غالب کا یہ شعر اکثر پڑھتے رہتے ہیں۔

تھا عشق کا موجب بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

ہم ملک و قوم کی قسمت کے ذمہ داروں سے، لیڈروں سے، علماء سے، اخباروں سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس مسئلے پر نہایت سنجیدگی سے غور کریں۔ اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں کچھ حدود و قیود متعین کی ہیں، اس شعبے سے متعلق جو حدود و قیود ہیں اسلام کے دوسرے اصولوں کی طرح وہ بھی نہایت زریں ہیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ہر چیز میں مغرب کی نقالی کے عادی ہیں بلکہ مغرب کی چیزیں ہم اپنے سوء استعمال سے کچھ اور بگاڑ لیتے ہیں جس کے سبب سے ان کے شر میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور اگر ان کے اندر خیر کا کوئی پہلو ہوتا بھی ہے تو ہم اس سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

اس الیکشن کے دوران میں صدر ایوب کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے کہ ملک کے کن کن طبقات میں ان کے خلاف آزردگی پائی جاتی ہے۔ ان آزردہ طبقات نے جو روش اختیار کی اگرچہ ہمیں اس سے بالکل اتفاق نہیں، انہوں نے ایک نہایت نازک موقع پر ایک ایسے فتنے کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی جس سے ملک کی بچی کھچی اسلامی روایات اور ملک کی سالمیت ہر چیز خطرے میں پڑ گئی تھی لیکن اس کے باوجود ہم یہی گزارش کریں گے کہ صدر ایوب ان تمام طبقات کی آزردگی کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کریں اور ان کی شکایات میں سے جو شکایات بھی جائز ہوں ان کو دور کر دیں۔ علماء ہوں یا وکلا، طلبہ ہوں یا اساتذہ، ہر ایک کے باب میں ہماری یہی گزارش ہے۔ اور اس گزارش کی بنیاد ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ آئندہ کے انتخابات کے لئے ان کو ہموار کرنا ضروری ہے۔ اس پہلو سے اب ہمارے نزدیک ان کی کچھ زیادہ اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔ ہماری گزارش کی بنیاد صرف یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے صدر ایوب کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ وہ ملک کے ہر طبقہ بلکہ ہر فرد کی جائز شکایت

دور کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی شکایات اس وجہ سے ناقابلِ اعتنا نہیں قرار دی جا سکتیں کہ وہ اپنے منشا کے مطابق تبدیلی لانے میں ناکام رہے ہے۔ اگر ان کی کوئی بات بھی حق ہے تو وہ ہر حال میں حق ہے وہ اس وجہ سے ناحق نہیں ہو جائے گی کہ انتخاب کے معاملے میں ان کی روش غلط رہی۔

پاکستان مسلم لیگ کے ذمہ داروں سے ہماری گزارش یہ ہے کہ آپ کی پارٹی کو اللہ تعالیٰ نے جو شاندار فتح عطا فرمائی اس فتح کو اس ملک کے استحکام اور اس کے اندر اسلامی احکام اور اسلامی روایات کے فروغ کے لئے استعمال کیجئے۔ آپ کی ہر چیز کی طرح یہ اقتدار بھی اللہ کی امانت ہے قرآن میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ اقتدار کی امانت اللہ تعالیٰ جس کو سونپتا ہے تو اس لئے سونپتا ہے کہ دیکھے کہ اقتدار پا کر کون اللہ کی راہ پر چلتا ہے اور کون شیطان کی راہ پر۔ یہ چیز آپ سے مطالبہ کرتی ہے کہ آپ خود خدا کی شریعت کی پابندی کریں اور اسی شریعت کو اس ملک میں نافذ کریں جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اقتدار بخشا ہے۔ پاکستانی قوم کا شروع سے مِن حیث القوم اللہ سے یہ عہد ہے کہ ہم اس خطہ زمین میں شریعت کا قانون جاری کریں گے، اس وعدے کے امین اور مسئول عند اللہ و عند الخلق آپ ہیں۔ اس وعدے پر سترہ سال کی مدت گزر چکی لیکن ہنوز روزِ اول ہے یہ بات واضح رہے کہ آپ حضرات کی بے پروائی یا غلط روی کی وجہ سے اس ملک میں جو گمراہی بھی پھیلے گی وہ سب آپ کے اعمالنامے میں لکھی جائے گی۔ حکومت کے حقوق جتنے زیادہ ہیں اس سے زیادہ اس کی ذمہ داریاں ہیں۔ دنیوی بھی، اُخروی بھی۔ یہ آپ حضرات کی ذمہ داری ہے کہ اپنے آپ کو بھی ٹھیک رکھیں، اپنی قوم کو بھی ٹھیک رکھیں اور اپنے صدر اور اپنی حکومت کو بھی ہر لغزش سے بچانے کی کوشش کریں۔ آپ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کیجئے کہ آپ کا کام صرف صاحبِ اقتدار کی رضا جوئی نہیں ہے بلکہ کائنات کے مقتدرِ حقیقی کی رضا جوئی ہے اور مقتدرِ حقیقی کی رضا جوئی کے لئے یہ پہلی شرط ہے کہ آدمی ہر ایک کو وہی مشورہ دے جو حق ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ اس کو اچھا لگتا ہے یا بُرا۔ مسلم لیگ کے ہر فرد کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ وہ اس ملک میں دو چیزوں کا ذمہ دار ہے۔ ایک اسلامیت دوسری سالمیت۔ اگر مسلم لیگ نے ان دونوں چیزوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو اس ملک کے نیچے

بہ کی دعائیں اور خدا کی نصرت اس کے ساتھ ہیں ۔ ہاں یہ بات بھی یاد رکھیئے کہ فتح کا احساس آپ ضات کے اندر مخالف کے لئے انتقام کا جذبہ نہ اُبھارے بلکہ ہمدردی اور خیر سگالی کا جذبہ جارے ابھی سے آپ اس ملک میں ایک مضبوط قوم ابھار سکیں گے ۔

چند معروضات ہم اپوزیشن کے بزرگوں کی خدمت میں بھی پیش کرنا چاہتے ہیں :-

اپوزیشن اگرچہ جمہوریت، خاص طور پر پارلیمانی جمہوریت کے ناگزیر لوازم میں سے سمجھی جاتی ہے یکن ہمارے ہاں اپوزیشن نے جس طرح کا مظاہرہ کیا ہے اس سے تو ہم یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتے یں کہ یہ چیز عقل، فطرت اور اسلام سب کے خلاف ہے۔ اپوزیشن کا کام اگر اقتدار کی ہر بات مخالفت کرنا ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد، اور رائی کا پربت اور سوئی کا بھاوڑا بنانا ہے تو پھر کون ی ہوش آدمی اُس کے جواز کو تسلیم کر سکتا ہے ۔ اگر اس کے سوا اس کا کوئی اور مقصد ہے، جس خیر کا بھی کوئی پہلو ہے، تو ہم اپوزیشن کے سربراہوں کو یہ مشورہ دیں گے کہ اس کو جلد سے جلد سامنے یں اس لئے کہ خود انہوں نے اس کی جو مثال پیش کی ہے اس کو دیکھ کر تو اس ملک کا خدا ترس اور ماط طبقہ اپوزیشن کے وجود سے سخت اندیشوں میں مبتلا ہو گیا ہے ۔ ہم تو اس اپوزیشن کو دیکھ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کا کام صرف اقتدار حاصل کرنا ہے اگرچہ اس کے لئے اسے ملک کے منوں سے بھی ساز باز کرنا پڑ جائے اور اگرچہ اس اقتدار کو حاصل کر کے ایک صبح و شام کیلئے بھی وہ اس نہ سنبھال سکے ۔ ہم اس امر سے انکار نہیں کرتے کہ اپوزیشن پارٹیاں کبھی کبھی مشترک مفاد کے لئے ڑ جوڑ بھی کر لیا کرتی ہیں لیکن ہمارے ہاں اپوزیشن نے جس طرح کا گٹھ جوڑ کیا ہے اس کی مثال ہمیں موری پارٹیوں کی تاریخ میں اگر ملتی ہے تو بس اپنے ہی ملک میں ملتی ہے ۔ اس کے سوا کسی اور ب میں نہیں ملتی ۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دوسرے ملکوں کے لوگ اقتدار حاصل کرنے کے لئے ی اپنے سامنے کچھ اصول رکھتے ہیں جن کی پیروی ضروری سمجھتے ہیں اور ان کے درمیان اتحاد و ختلاف کی بنیاد انہی اصولوں پر استوار ہوتی ہے ۔ برعکس اس کے ہمارے ہاں اقتدار کے صول کے معاملے میں عزیز صرف مقصد ہوتا ہے، اصول کا کوئی سوال نہیں ہے ۔ اگر اس راہ ، فرشتے حائل ہوں تو ان سے بھی جنگ کی جا سکتی ہے اور اگر شیطان بھی ساتھی بن جائے تو اس سے بھی

دوستی گانٹھی جا سکتی ہے ۔

ہم ایک مسلمان کی حیثیت سے جب اس مسئلے پر غور کرتے ہیں تو یہ کہنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں کہ اسلام میں اپوزیشن کے اس خلاف عقل تصور کا کوئی وجود نہیں ہے ۔ کسی کافرانہ حکومت کی بات تو الگ ہے لیکن اگر حکومت اسلامی یا کم از کم مسلمانوں کی اپنی قومی حکومت ہے تو اس کے اندر ایک ایسی پارٹی قائم کرنا جس کا مقصد محض اختلاف برائے اختلاف ہو ، ایک ایسی اجنبی بات ہے جس کو ایک مسلمان کا ذہن آسانی سے قبول نہیں کر سکتا ۔ ہم نے اسلام کے اجتماعی مسائل کا جس حد تک مطالعہ کیا ہے اس سے ہم نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر مسلمان پر اپنی حکومت کی خیر خواہی لازم ہے ۔ احادیث میں اس کے لئے نصیحت کا لفظ آیا ہے جس کے معنی خیر خواہی کے ہیں ۔ اس خیر خواہی کے قرآن و حدیث میں بہت سے تقاضے بھی بیان ہوئے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ ان تمام کاموں میں جو ترقی و بہبود کے ہوں اس کے ساتھ تعاون کیا جائے ، اس کو مشورے دینے میں اخلاص و خیر خواہی کو مدنظر رکھا جائے ۔ مشکلات و خطرات میں اس کی پوری پوری مدد کی جائے ، اس کے عمدہ کاموں پر اس کی تحسین کی جائے ، اگر وہ کوئی غلطی کرے تو اس پر اُس کو ٹوکا جائے ۔ اگر حکمران نااہل یا بے دین ہو اور اس بات کا امکان ہو کہ پرامن طریقے سے اس کو اس سے زیادہ اہل اور دیندار حکمران سے تبدیل کیا جا سکتا ہے تو اس کو بدل دیا جائے ۔ اسلام میں اپوزیشن کا بس یہ تصور ہمیں ملتا ہے لیکن اس بات کا جواز ہمیں کہیں نہیں ملتا کہ کچھ لوگ حکومت کی مخالفت کو اپنا پیشہ بنا لیں ، اس کی اچھی باتوں کو بھی عیب کے رنگ میں پیش کریں ، عوام میں جھوٹ ، مبالغہ آرائی اور افسانہ طرازی سے اس کو بدنام اور ذلیل کرنے کی کوشش کریں ۔ اقتدار کی طلب کے سوا کوئی اصول بھی اُن کے درمیان مشترک نہ ہو ، خود تجربے کی کسوٹی پر کھوٹے ثابت ہو چکے ہوں ، دین یا دنیا کے کسی پہلو سے بھی قابل ترجیح نہ ہوں لیکن دعوے کریں کہ اگر اقتدار ان کے سپرد کر دیا جائے تو وہ ملک کو بہشت بریں بنا دیں گے ۔ پھر مزید ستم یہ کہ دین ، ملک ، قوم اور حکومت کے جتنے مخالف اُن کو مل سکیں سب کو جمہوریت کے نام پر جمع کر کے ملک پر یلغار کر دیں اور ایک ایسی محترمہ کو حکومت پر مسلط کر دینے کی کوشش کریں جن کے ہاتھوں دین اور دنیا دونوں کا بیڑا غرق ہو جائے ۔ جمہوریت ہو یا اسلام

ہم نہیں سمجھتے کہ ان میں سے کسی میں بھی اس نوع کی کسی اپوزیشن کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

ہم بجائے خود اپوزیشن کے مخالف نہیں ہیں۔ موجودہ زمانے میں جس طرح مردم جمہوریت ایک ناگزیر برائی کی حیثیت رکھتی ہے جس سے مفر نہیں ہے اسی طرح اس جمہوریت کے "بچۂ شتر" اپوزیشن سے بھی مفر نہیں ہے۔ لیکن ہم اپوزیشن کے علمبرداروں سے درخواست کرتے ہیں کہ یا تو وہ اپوزیشن کو خالص اسلامی اصولوں پر مرتب کریں جس کا مقصد بر و تقویٰ میں تعاون اور اثم و عدوان کی مزاحمت ہو، اس پارٹی میں انہی لوگوں کو لیں جو اسلام کے اصولوں پر عقیدہ رکھتے ہوں اور جو اپنے اختلاف و اتفاق کو اسلام کے ضابطۂ اخلاق کا پابند بنا سکتے ہوں۔ اور اگر اس کی ہمت یہ حضرات اپنے اندر نہیں پاتے ہیں تو پھر دین جمہوریت کے لحاظ سے بھی ادنیٰ درجہ ایمان یہ ہے کہ امریکہ اور انگلستان کی اپوزیشن پارٹیوں کے اسوہ کی پیروی کریں۔ اس سے نیچے جمہوریت میں بھی کوئی درجہ ایمان نہیں ہے۔ ہم نے اس اپوزیشن کو مینڈکوں کی پنسیری سے جو تشبیہ دی تھی تو یہ بات یوں ہی نہیں تھی۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس تشبیہ کی حقیقت ہر شخص کے سامنے واضح ہو جائے گی۔ چوہدری محمد علی صاحب ایک مینڈک کو پلڑے میں رکھیں گے تو دوسری پھدک جائے گی، دوسری کو رکھیں گے تو تیسری پھدک جائے گی۔ اب اس پنسیری کو باندھے رکھنا ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی فطرت میں انتشار تھا۔ اور اب اس فطرت کا بروز شروع ہو گیا ہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ مس فاطمہ جناح ہار گئیں۔ تصور کیجیے کہ خدانخواستہ وہ جیت جاتیں اور اس کے بعد یہ انتشار ہوتا (اور ضرور ہوتا) تو اس وقت ملک کا کیا بنتا؟

جماعت اسلامی کے حضرات ہم سے بہت برہم ہیں اور اس برہمی میں ایک اعصابی جنگ ان حضرات نے ہمارے خلاف پورے زور و شور کے ساتھ شروع کر دی ہے۔ ہر ڈاک سے ہمیں ان کے بکثرت خطوط موصول ہو رہے ہیں جن میں سے اکثر تو گمنام ہوتے ہیں۔ لیکن بعض بعض بانام بھی ہوتے ہیں۔ مضمون سب کا ایک، انداز بیان و استدلال ایک، گالیوں اور طعنوں کی تراش خراش ایک۔ ہر چیز ایک ہی کارخانے بلکہ ایک ہی سانچے کی ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ صدر ایوب کا تو یہ حضرات کچھ بگاڑ نہ سکے اب اس محاذ سے جو فوج ظفر موج فارغ ہوئی ہے تو ہم پر پل پڑی ہے۔ آخر میگزین میں جو گولہ و

بارود بچا کھچا موجود ہے وہ ضائع کیوں جائے، دشمن کا قلعہ نہ مسمار ہو سکا تو نہ سہی ایڈیٹر "میثاق" کا جھونپڑا ہی سہی، مقصود تو جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

دامن اس کا تو بہت دُور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار، گریباں تو مرا دُور نہیں

اکتوبر کا "میثاق" جب نکلا تو بعض شہروں سے مجھے میثاق کے قدر دانوں کی طرف سے یہ شکایات موصول ہوئیں کہ ہم میثاق مقامی ایجنٹ سے خریدتے رہے ہیں لیکن اس مرتبہ ایجنٹ سے معلوم ہوا کہ سارے پرچے پارسل موصول ہوتے ہی ایک ہی صاحب خرید کر لے کر چلے گئے۔ ہم نے اس واقعہ کو میثاق کی قدر دانی پر محمول کیا اور خاموش رہے۔ نومبر میں یہی شکایات متعدد شہروں سے پھر موصول ہوئیں اور ساتھ ہی اس حقیقت کا انکشاف بھی ہوا کہ یہ نیک کام صالحین کر رہے ہیں۔ اور مقصود اس سے یہ ہے کہ میثاق اپنے قدر دانوں تک نہ پہنچ سکے اور اس میں جو مضامین صدارت کے مسئلہ پر نکل رہے ہیں وہ پردہ خفا میں رہ جائیں۔ ان حضرات کی خواہش تو یہی تھی اور شاید یہ اس خواہش میں حق بجانب بھی ہوں لیکن افسوس ہے کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ جن مضامین کو چھپانے کے لئے ان حضرات نے یہ سعادت دارین کمائی وہ لاکھوں کی تعداد میں چھپے اور ملک کے دونوں بازوؤں میں ہر پڑھے لکھے تک پہنچے۔ تمام بڑے اخبارات نے ان کی پورے اہتمام سے اشاعت کی۔ لوگوں نے ان کے ایک ایک پیرے کو پوسٹروں اور اشتہاروں کی صورت میں گلی گلی میں پھیلایا۔ مقرروں نے ان کے جملوں کو اپنی تقریروں میں دہرایا۔ لاکھوں کی تعداد میں یہ پمفلٹ کی شکل میں ہوائی جہازوں سے مختلف شہروں پر پھینکے گئے، بنگالی میں بھی ان کا ترجمہ ہوا اور وہ اردو نہ جاننے والوں تک پہنچائے گئے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج تک ہر طبقہ، ہر درجہ، اور ہر مکتب فکر کے لوگوں سے جو داد مجھے ان مضامین پر ملی ہے اس سے پہلے کسی چیز پر بھی نہیں ملی، حد یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے حلقوں سے بھی مجھے ان پر اتنی داد ملی ہے کہ عجب نہیں کہ وہ مقدار میں ان کی گالیوں کے برابر نکلے۔ میں دونوں کا حساب کرا رہا ہوں اگر دعائیں گالیوں سے کم ہوئیں تو مزید دعاؤں کا مطالبہ کروں گا اور اگر حساب برابر سرابر ہو گیا تو دعا کروں گا کہ

اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کے صلے میں ان کی گالیوں کو معاف کر دے۔

گالیاں دینے والے حضرات میں سے بعض نے مجھے "بزدل" لکھا ہے۔ درانحالیکہ خود ان کی اپنی بہادری کا یہ عالم ہے کہ خط پر اپنے نام لکھنے کی جرأت نہیں فرمائی ہے۔ حالانکہ انہیں خوب علم ہے کہ اگر وہ اپنے نام ثبت فرما دیتے جب بھی اُن کو کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں ان کو کوئی نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں ایسے لوگوں کو مجرم سمجھتا بھی نہیں جو گمنام خطوط میں گالیاں لکھتے ہیں۔ میں تو ان کو فتورِ عقل کا مریض سمجھتا ہوں اور ان پر ترس کھاتا ہوں۔

بعض حضرات نے مجھکو تملّق اور خوشامد کا طعنہ دیا ہے کہ میں صدر ایوبؒ کی خوشامد کر کے اس کے صلے میں کسی عہدے یا انعام کا آرزومند ہوں اور بشارت دی ہے کہ ان مضامین کے بعد اب کوئی نہ کوئی انعام ضرور مل کے رہے گا۔ بلکہ بعض اہلِ خبر نے تو یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "اب روپوں کی تھیلیاں پہنچ رہی ہوں گی"۔ ان دوستوں کو کون بتائے کہ نہ ہم اتنے خوش قسمت ہیں اور نہ صدر ایوبؒ شاہ سعود کی طرح ایسی کچی گولیاں کھیلے ہوئے ہیں کہ ہمارے دو مضمونوں پر ریجھ کر تحفے اور عہدے بخشنے شروع کر دیں۔ پھر ان دوستوں کو شاید پتہ نہیں ہے کہ اپنی اصلی محرومی یہ نہیں ہے کہ دنیا ملی نہیں ہے بلکہ اصلی محرومی یہ ہے کہ اس کو سنبھالنے اور برتنے کا سلیقہ اپنے اندر نہیں ہے۔ رب کریم نے اپنے خزانۂ جود سے جو کچھ دے رکھا ہے وہی بہت ہے جب اسی کے سنبھالنے اور برتنے کا سلیقہ نہیں ہے تو مزید کی آرزو کیوں کریں؟

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ طالب ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھود یں جا کے معدن کو

افسوس ہے کہ یہ طعنہ دینے والے حضرات یہ نہیں سوچتے کہ جب وہ دوسرے کی نسبت یہ گمان رکھنے میں اپنے کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ اس نے صدر ایوبؒ کی حمایت کسی لالچ ہی سے کی ہے تو آخر وہ لوگ حق بجانب کیوں نہ سمجھے جائیں جو علانیہ ان حضرات کو بیرونی طاقتوں کا ایجنٹ سمجھتے ہیں۔

اس دوران میں جو لوگ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے ہیں ان میں سے دو بزرگوں نے اس بات کی وضاحت ضروری سمجھی ہے کہ وہ میرے مضامین سے متاثر ہو کر نہیں علیحدہ ہوئے ہیں، بلکہ خود اپنی اندرونی تحریک سے علیحدہ ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں ان حضرات کو یہ غلط فہمی کیوں ہوئی کہ میں ان کے اس نیک اقدام کا کریڈٹ خود لینا چاہتا ہوں۔ ان دونوں حضرات میں سے ایک صاحب سے میری واقفیت سرسری ہے، میں ان کی صلاحیتوں اور ان کے احساسات سے زیادہ باخبر نہیں ہوا۔ دوسرے صاحب سے البتہ دیرینہ روابط اخلاص و محبت رکھتا ہوں اور ان کے احساسات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ اللہ کے فضل سے خود صاحبِ علم و نظر ہیں، میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ کسی معاملے میں مجھ جیسے کسی ہیچ میرز کی رہنمائی کے محتاج ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے جو قدم بھی اٹھایا ہے یقیناً اپنے ہی علم اور اپنے ہی ضمیر کی رہنمائی میں اٹھایا ہوگا۔ ویسے وہ میرے اُن مضامین کے چوٹی کے قدر دانوں میں رہے ہیں جو میں نے جماعت اسلامی کے نظریۂ حکمت عملی کی تردید میں لکھے ہیں۔ میں ان کو اور اس دوران میں جماعت سے علیحدہ ہونے والوں کو یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ میں نے جو مبارک باد دی تھی وہ ان حضرات کو سامنے رکھ کر نہیں دی تھی بلکہ جماعت کے بہت سے دوسرے وابستگان تھے جن کے تأثرات اور عزائم خطوط یا پیغامات کی صورت میں میرے پاس یا میرے علم میں ہیں۔ یہ ساری چیزیں اپنے وقت پر لوگوں کے سامنے آجائیں گی۔ یہ بات بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جماعت سے جو لوگ علیحدہ ہو رہے ہیں اُن کی علیحدگی میرے لئے کچھ اس وجہ سے باعث مسرت نہیں ہے کہ میں اس ملبے سے کوئی عمارت بنانا چاہتا ہوں بلکہ صرف اس پہلو سے کہ یہ حضرات ایک عظیم فتنہ سے علیحدہ ہو گئے۔ اب جماعت اسلامی کے معاملات سے مجھے کچھ زیادہ تعلق خاطر نہیں رہ گیا ہے۔ اس جماعت نے متحدہ محاذ کا جو پھندا اپنی گردن میں ڈالا تھا، ۲ر جنوری ۶۵ء کی شام کو اس نے اس پھندے سے خود اپنے ہاتھوں خودکشی کر لی۔ اب جو حضرات مجھے گالیاں دے رہے ہیں، بہتر ہے کہ وہ خود اپنے سر پیٹیں اور اپنی بدبختی پر ماتم کریں۔ میری جان اب خدا کے واسطے چھوڑیں۔

آج میں جماعت اسلامی ہند سے بھی کچھ گلہ کرنا چاہتا ہوں۔ میثاق کے قارئین اس بات

اچھی طرح واقف ہیں کہ میں نے جماعت اسلامی ہند کے خلاف ان صفحات میں کبھی ایک فقرہ بھی نہیں لکھا۔ بحیثیت مجموعی اس کے متعلق میری رائے اچھی ہی رہی ہے۔ میں وقتاً فوقتاً دعا بھی کرتا رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو آفات سے بچائے اور یہ بھارت کے مسلمانوں کی خدمت کی توفیق پائے۔ اس جماعت سے وابستہ بعض رسائل مجھے ہمیشہ اپنی گالیوں سے نوازتے بھی رہتے ہیں لیکن میں نے ان کا بھی کبھی نوٹس نہیں لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان رسالوں کا جماعت اسلامی پاکستان سے یہ شریفانہ معاہدہ ہے کہ وہ جتنی گالیاں میثاق کے ایڈیٹر کو دیں گے فی گالی کے حساب سے پاکستان کی جماعت ان کے اتنے ہی پیچھے بیچے گی۔ یہ ان کے معاش اور پیشے کا معاملہ تھا اور میں دوسروں کے پیشے کے معاملے میں مرزا غالب کی طرح بڑا روادار واقع ہوا ہوں۔

پیشہ میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام

میرے اس رویے کے مقابل میں جماعت اسلامی ہند کا رویہ میں ابتدا سے یہ دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان کی جماعت پر جب میں کوئی تنقید کرتا ہوں تو وہاں کے بہت سے ارکان مجھے گمنام نصیحتوں اور گالیوں کے خطوط لکھنے شروع کر دیتے ہیں اور فوراً ایک فریق بن کر اپنے پاکستانی امیر کی حمایت میں مورچے سنبھال لیتے ہیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں جگہ قیادت کا مزاج اور ارکان کی تربیت کا انداز ایک ہی ہے۔ اس موقع پر بھی بعض حضرات نے مجھے آگاہ کیا ہے کہ میں نے "اپنی عاقبت خراب کر لی ہے" اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے صرف اس وجہ سے لکھا ہے کہ مجھے ان کے پاکستانی امیر صاحب پر حسد ہے۔ یہ الزام یہ حضرات مجھ پر پہلے بھی لگاتے رہے ہیں لیکن میں نے اس کو نظر انداز کیا کہ جب یہ لوگ مولانا تھانوی، مولانا مدنی، مولانا گیلانی مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد، مفتی کفایت اللہ، مولینا عبدالماجد دریابادی، مولانا منظور نعمانی اور نہ جانے کن کن لوگوں کو اپنے حاسدوں میں شمار کرتے ہیں تو میں کس شمار قطار میں ہوں، میں تو ان بزرگوں کی جوتیوں کا تسمہ بھی کھولنے کے لائق نہیں۔ لیکن آج مجھے ان حضرات کے اس الزام کے جواب میں یہ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ اگر فی الواقع میں اتنا ہی پست ہمت انسان ہوں کہ ان کے پاکستانی امیر صاحب پر بھی حسد کر سکتا ہوں تو یہ حضرات میری عاقبت کی طرف سے کیا مایوس ہیں، مجھے خود بھی اپنی عاقبت سے مایوسی ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اس درجہ پست ہمت آدمی کے لئے یقیناً خدا

کی جنت میں کوئی جگہ نہیں ہے! ان دوستوں کو کون بتائے کہ جن چھوٹی آنکھوں سے وہ دنیا کو دیکھتے ہیں ضروری نہیں کہ دوسرے بھی انہی آنکھوں سے دیکھتے ہوں!

میں جماعت اسلامی ہند کے ارباب حل و عقد سے یہ گزارش بھی کرتا ہوں کہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ یہاں کی جماعت جو مکھی مارے اس پر آپ بھی اپنی مکھی ضرور مار دیا کریں۔

آپ حضرات کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ چونکہ بعض فقہا نے لکھا ہے کہ حالت اضطرار میں عقیدۂ توحید کا صرف ظاہری اقرار ہی سقوط قبول کرتا ہے، قلبی اعتقاد کسی حالت میں سقوط قبول نہیں کرتا اس وجہ سے جماعت اسلامی نے حرمتوں کے درمیان ابدی اور غیر ابدی کی جو تقسیم کی ہے وہ صحیح ہے۔ قلبی اعتقاد جو سقوط قبول نہیں کرتا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ظاہری اقرار کے سقوط سے اضطرار رفع ہوجاتا ہے تو جب ظاہری اقرار سے اضطرار رفع ہوگیا آخر باطنی اعتقاد کیوں سقوط قبول کرے۔ کوئی دشمن دیکھ یا سن تو ظاہری اعمال و اقرار ہی کو سکتا ہے، نہ کہ دل کو چیر کر اندر کے اعتقاد کو دیکھ سکتا ہے۔ پھر جب مسجد کی دیوار کے ڈھا دینے سے رفع شر ہوجاتا ہے تو آخر اس کی بنیاد اکھاڑنے کی کیا ضرورت باقی رہی۔ اگر کسی نے یہ بات لکھی ہے کہ قلبی اعتقاد کسی حالت میں سقوط نہیں قبول کرتا تو اس نے سمجھ کی بات لکھی ہے۔ اس کا مقصد حرمتوں کے درمیان ابدی اور غیر ابدی کی تقسیم کا فتنہ برپا کرنا نہیں ہے بلکہ آپ حضرات کو یہ بتانا ہے کہ اضطرار اگر صرف شاخ کے کاٹنے سے رفع ہوسکتا ہے تو درخت کو اکھاڑنے کی کوشش نہ کرو۔

یہ خیال بھی آپ کے مفتی صاحب کا بالکل غلط ہے کہ قتل کی حرمت بھی ان حرمتوں میں سے ہے جو کسی حالت میں سقوط قبول نہیں کرتی۔ واضح رہے کہ انفرادی اضطرار میں تو بالعموم یہی صورت ہے کہ قتل ناحق کی حرمت ساقط نہیں ہوتی لیکن اجتماعی اضطرار کی بہت سی حالتیں ہیں جن میں قتل ناحق تو درکنار قتل مومن کی حرمت بھی ساقط ہوجاتی ہے۔ اس کا ذکر قرآن، حدیث، فقہ سب میں ہے۔ فقہا نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اگر کفار مسلمانوں کی کسی بستی یا قلعہ پر حملہ کریں اور تدبیر یہ اختیار کریں کہ اپنی فوج کے آگے آگے کچھ بے گناہ مسلمانوں کو بطور ڈھال استعمال کریں کہ ان کے سبب سے مسلمان ہم پر تیر اندازی یا سنگباری نہ کریں گے تو مسلمانوں کے لئے بوجہ اضطرار یہ بات جائز ہوگی کہ وہ مسلمانوں

[redacted]

کی جان کی پرواکئے بغیر دشمن کا منہ توڑ جواب دیں - یہ پرانی مثال ہوئی - ہیں اس کے علاوہ ایک تازہ مثال پیش کرتا ہوں - فرض کیجئے بھارت ہم پر حملہ کر دیتا ہے اور بلا امتیاز ہمارے شہروں پر بمبارد شروع کر دیتا ہے تو اس کے جواب میں آخر ہم بھی اس امر میں حق بجانب ہوں گے کہ اس کے شہروں پر بم باری کریں - جس کے نتیجے میں اس امر کا واضح امکان ہے کہ نہ صرف غیر مصافی آبادی ہلاک ہو بلکہ بہت سے مسلمان مرد، عورتیں اور بچے بھی ہلاک ہوں - قتل مسلم اگرچہ بہت سنگین بات ہے لیکن صورتِ اضطرار کی وجہ سے یہ گوارا کرنی پڑے گی -

---

زنا کی حرمت بھی اضطرار میں جو ساقط نہیں ہوتی تو اس کی وجہ بھی یہ نہیں ہے کہ اس کی حرمت دوسری حرمتوں کے مقابل میں ابدی ہے اور دوسری سقوط قبول کر لینے والی حرمتیں غیر ابدی ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اضطرار میں کسی حرمت سے فائدہ اٹھانے کے لئے "غَیْرَ بَاغٍ" کی شرط ہے یعنی یہ فائدہ اٹھانا دل کے میلان اور رغبت سے نہ ہو بلکہ بیزاری، انقباض اور کراہت سے ہو - ظاہر ہے کہ زنا ایسا فعل نہیں ہے جو انقباض اور بیزاری کے ساتھ واقع ہو سکے - اس کے لئے شہوت کا ہیجان ناگزیر اور شہوت کے ہیجان کے لئے دل کا میلان، نفس کا نشاط، اقدام کا جوش اور غلبہ کا ولولہ ضروری ہے - اپنی اس شرط کے سبب سے یہ حرمت اضطرار میں سقوط قبول نہیں کر نہ اس وجہ سے کہ حرمتوں میں ابدی اور غیر ابدی قطعی اور غیر قطعی کے قسم کی کوئی تفریق و تقسیم ہے

آپ حضرات کے فقیہ صاحب کا یہ خیال بھی بالکل باطل ہے کہ فقہا جو "ضرورت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور جس کے تحت وہ ممنوعات کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، یہ لفظ اس معنی میں ہے جس معنی میں ہم آپ اپنی بول چال میں لفظ ضرورت استعمال کرتے ہیں - اگر اس معنی میں ہے تب تو سمجھئے کہ تمام حرمتوں کے دروازے آپ نے چوپٹ کھول دیئے - آپ کے اس فتوے کے بعد کم از کم ہمارے پرویز صاحب اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کو تو کسی چیز کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی - اس ضرورت کے ساتھ "شدید" کا اضافہ کر کے جماعت اسلامی پاکستان کے فقیہ نے جو احتیاط برتی ہے اس سے بھی ان کی راہ میں کوئی مزاحمت واقع نہیں ہوگی - اسی میثاق

ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے ایک مضمون "خاندانی منصوبہ بندی اور مذہب" پر چار قسطوں میں میں نے تنقید کی ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیم حکومت پاکستان کے زیر اہتمام چل رہی ہے اور اس کی حمایت میں آج سب سے بڑی جو دلیل دی جا رہی ہے وہ یہی ہے کہ موجودہ غذائی بحران میں اس کی شدید ضرورت ہے۔ اسی شدید ضرورت کی دلیل، وہ سود کے حق میں، بے پردگی کے حق میں، مخلوط تعلیم کے حق میں، سینما کے حق میں، اور پھر یورپ اور امریکہ میں پہنچ کر خنزیر و خمر اور منخنقہ کے حق میں اور نہ جانے کن کن حرمتوں کے حق میں پیش کرتے ہیں۔ اب تک تو ہم ان کے الٹے سیدھے کچھ جواب دے لیتے تھے لیکن اب جب جماعت اسلامی پاکستان اور جماعت اسلامی ہند دونوں کے فقہا اس بات پر متفق ہو گئے کہ ضرورت کے تحت حرام چیزیں حلال ہو جاتی ہیں اس لئے کہ "الضرورات تبیح المحظورات" تو اب کہاں مجالِ دم زدن رہی ہے۔

میں نہایت ادب سے یہ عرض کرتا ہوں کہ فقہا جو "ضرورت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں یہ ان کی اپنی ایک اصطلاح ہے اور اس سے ان کی مراد وہی چیز ہے جس کو قرآن میں اضطرار کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اضطرار کا مفہوم اردو میں ہرگز ضرورت یا شدید ضرورت سے ادا نہیں ہوتا۔ میں اس سلسلے کے مضامین میں واضح کر چکا ہوں کہ اضطرار کے معنی بے بسی کی اس حالت کے ہیں جس میں آدمی کے لئے دو حراموں میں سے ایک حرام کے اختیار کرنے کے سوا اور کوئی مفر باقی ہی نہ رہ جائے اس مضمون کو ہم اپنی بول چال میں ضرورت یا شدید ضرورت سے تعبیر نہیں کرتے۔ یہ تعبیر ایجاد کر کے آپ حضرات نے دین کے خلاف ایک بہت بڑے فتنے کا دروازہ کھول دیا ہے۔ یہاں کی جماعت تو اس مولود فساد کو جن کر خود مر گئی اب اگر اس کی رضاعت و حضانت کا بار آپ حضرات نے اٹھا لیا ہے تو اس کو مسلمانوں کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

آخری گزارش ان حضرات کی خدمت میں یہ ہے کہ اصل سوال جس پر ان حضرات کو غور کرنا تھا وہ تو یہ تھا کہ صدر ایوب کے مقابل میں مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ جو جماعت اسلامی نے بعذرِ اضطرار کیا، وہ از روئے شرع ٹھیک ہے یا نہیں؟ یہی سوال بنائے بحث ہے اور اس پ

میں نے تفصیل کے ساتھ نومبر کے میثاق میں گفتگو کی ہے۔ لیکن اس سوال کو یہ حضرات یہ کہہ کر ٹال جاتے ہیں کہ یہ مسئلہ ان کے طے کرنے کا نہیں بلکہ پاکستان کے مسلمانوں کے طے کرنے کا ہے۔ عرض ہے کہ آپ صاحبان کے طے کرنے کا کیوں نہیں ہے ؟ آپ مس فاطمہ جناح سے بے خبر ہیں یا صدر ایوب سے یا پاکستان کے حالات و مسائل سے یا مابہ النزاع مسئلے میں شریعت کے احکام سے ؟ اگر یہ ساری باتیں آپ حضرات کے سامنے ہیں تو ایک ضمنی مسئلے پر اظہار فقاہت اور اصل مسئلے سے تجاہل و تغافل کی روش کیوں اختیار کی گئی ؟ کیا اس سے یہ بات نہیں نکلتی کہ اصل سوال پر تو آپ حضرات جماعت کے موقف کی ہمنوائی کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار نہیں لیکن اس جھگڑے میں جماعتی عصبیت کے تحت آپ اپنا وزن جماعت ہی کے پلڑے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ مدعیانِ دین کی یہی وہ حرکتیں ہیں جن سے موجودہ نسل روز بروز دین اور اہل دین سے بددل اور بدگمان ہوتی جارہی ہے۔

خانہ شرع خراب ست و ارباب صلاح
در عمارت گری گنبد دستار خود اند

تدبر قرآن
امین احسن اصلاحی

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ (۳)

مدنی ——— آیات ——— ۳۰۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(سورہ کا موضوع اور سابق سورہ سے اس کا ربط)

سورہ کا موضوع اور سابق سورہ سے اس کا ربط

مندرجہ ذیل پہلوؤں سے یہ سورہ۔ سابق سورہ (بقرہ) سے نہایت گہرا ربط رکھتی ہے:-

۱- ان دونوں کا موضوع ایک ہی ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات ـ لوگوں پہ عموماً اور اہل کتاب پر خصوصاً۔

۲- دونوں میں یکساں شرح و بسط کے ساتھ دین کی اصولی باتوں پر بحث ہوئی ہے۔

۳- دونوں کا قرآنی نام بھی ایک ہی ہے۔

۴- دونوں شکلاً بھی ایک ہی تنے سے پھوٹی ہوئی دو بڑی بڑی شاخوں کی طرح نظر آتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو شمس و قمر سے تشبیہ دی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ دونوں حشر کے دن دو بدلیوں کی صورت میں ظاہر ہوں گی۔ اہل بصیرت سمجھ سکتے ہیں کہ وصف اور تمثیل میں یہ اشتراک بغیر کسی گہری مناسبت کے نہیں ہو سکتا۔

۵- دونوں میں زوجین کی سی نسبت ہے۔ ایک میں جو بات مجمل بیان ہوئی ہے، دوسری میں اس کی تفصیل بیان ہو گئی ہے۔ اسی طرح ایک میں جو خلا رہ گیا ہے، دوسری نے اس کو پر کر دیا ہے۔ گویا دونوں مل کر ایک اعلیٰ مقصد کو اس کی مکمل شکل میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔

(بقرہ اور آلِ عمران کے امتیازی پہلو)

لیکن اس اشتراک اور یکسانی کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی کچھ الگ الگ خصوصیات بھی ہیں جو ان کو ایک دوسری سے ممتاز کرتی ہیں۔ مثلاً :-

بقرہ پر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب اہلِ کتاب نے یہ محسوس کرلیا ہے کہ اسلام ایک سچا دین ہے اور یہ آہستہ آہستہ جڑ پکڑ رہا ہے لیکن حسد اور ضد کے باعث وہ اس کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ اس احساس نے ان کو شدید کشمکش میں ڈال دیا۔ وہ جذبات سے مغلوب ہوکر اس کی مخالفت کے لئے تو اٹھ کھڑے ہوئے لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ مخالفت کس عنوان سے کریں، جس کے منہ میں جو آیا اس نے وہ اگلنا شروع کر دیا۔ کسی نے کہا نبوت و رسالت کے لئے تو بنی اسرائیل کا گھرانا مخصوص رہا ہے، اس گھرانے سے باہر کسی کو نبوت کس طرح مل سکتی ہے؟ کسی نے کہا ہدایت کے لئے بس تورات کافی ہے اور جب اس کے حامل ہم موجود ہیں تو اب کسی نئی ہدایت کی ضرورت کہاں باقی رہی؟ اسی جھنجھلاہٹ میں بعضوں نے حضرتِ جبریلؑ تک کو مطعون کر ڈالا کہ یہ فرشتہ شروع سے ہمارا بیری ہے۔ کچھ لوگوں نے یہود و نصاریٰ کا ایک متحدہ محاذ بناکر مخالفت کا یہ پہلو اختیار کیا کہ آسمانی ہدایت یا تو یہودیت کے اندر ہے یا نصرانیت کے اندر، جس کو ہدایت مطلوب ہو وہ ان میں سے کسی کو اختیار کرے، ان کے سوا آسمانی ہدایت حاصل ہونے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے ایک گروہ نے دھوکا بازی کی روش اختیار کی۔ اس نے مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا چاہا کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں، مسلمان ایمان کا اجارہ دار تنہا اپنے ہی کو نہ سمجھیں، خدا آخرت اور اپنے پیغمبر کو تو ہم بھی مانتے ہیں، اس سے کیا فرق پیدا ہوا کہ ہم نئے مدعی نبوت کو نہیں مانتے۔ ان حالات میں یہ سورہ اتری۔ اس میں ایک طرف تو تفصیل کے ساتھ ان تمام اعتراضات کے جواب دیئے گئے جو اہلِ کتاب کی طرف سے اٹھائے گئے، دوسری طرف نبی امیؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی جو اعلیٰ سندیں خود ان کے صحیفوں میں موجود تھیں، اس کو واضح کیا گیا اور تیسری طرف نبی امیؐ کی رسالت سے دینِ حق کی جو تجدید بلکہ تکمیل ہوئی تھی اس کی طرف رہنمائی کی گئی۔ اس طرح یہ سورہ گویا دعوت و اثباتِ رسالت بھی ہے اور دعوت جہاد برائے آزادیٔ قبلہ و غزوۂ بدر بھی۔

سورہ آلِ عمران پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بقرہ کے کچھ عرصہ بعد اس دور میں نازل ہوئی ہے جب اُفق پر اسلام کے غلبہ اور اس کی صداقت کے آثار اتنے نمایاں ہو چکے ہیں کہ اہلِ کتاب کے لئے اس کی علانیہ مخالفت کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس صورتِ حال نے اہلِ کتاب کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن یہ اسلام صرف اس کی زبانوں ہی تک رہا، اس کے دلوں میں نہیں گھسا، دوسرے گروہ نے اسلام تو نہیں قبول کیا لیکن اس نے مسلمانوں کے ساتھ مذہب کے معاملے میں ایک سمجھوتا کرنے کی کوشش کی۔ اس سمجھوتے کے لئے اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہر مذہب کے پیروؤں کے لئے ان کا اپنا دین حق ہے اس وجہ سے مسلمان ہم کو ہماری یہودیت و نصرانیت پر چھوڑ دیں اور ہم مسلمانوں کو ان کے اسلام پر۔ اس طرح دونوں اپنے اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے ایک ہی ملک میں ایک ساتھ امن کی زندگی بسر کر سکیں گے[1]۔

اس طرح ان دونوں گروہوں کا رویہ اسلام کے ساتھ بدل تو گیا لیکن یہ تبدیلی دل کی تبدیلی کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ سر تا سر مصلحت پرستی پر مبنی تھی۔ پہلے گروہ نے اسلام کا جو اظہار کیا تو محض مسلمانوں کی متوقع کامیابیوں میں حصہ بٹانے کے لئے۔ دوسرے نے صلح جویانہ پالیسی اختیار کی تو صرف متوقع خطرات سے اپنے کو محفوظ کرنے کے لئے۔

اسی اثنا میں اُحد کا معرکہ پیش آیا جس میں مسلمانوں ہی کی ایک جماعت کی بے تدبیری سے اُن کو ایک عارضی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس واقعے کا اثر اہلِ کتاب کے مذکورہ دونوں گروہوں پر یہ ہوا کہ انھوں نے اسلام کے بارے میں اپنی پالیسی پھر تبدیل کر دی۔ جو گروہ محض دنیوی کامیابیوں کے لالچ میں اسلام کی صفوں میں آ گھسا تھا، جب اس نے دیکھا کہ اس راہ میں خطرات بھی پیش آ سکتے ہیں تو اس نے اس خطرے کے سودے سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور اسلام کی اطاعت کا قلادہ اُتار کر پھر اپنے کفر کی طرف پلٹ گیا۔ دوسرے گروہ نے جب دیکھا کہ اسلام کو زک بھی پہنچائی جا سکتی ہے تو اس نے سوچا کہ ہم نے جو اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اس کے ساتھ صلح جویانہ روش اختیار کر لی ہے، یہ غلط ہے، کیوں نہ ہم مخالف طاقتوں کو قوت پہنچا کر یہ کوشش

[1] سورہ بقرہ کے شروع میں اس گروہ کی طرف اشارہ ہے لیکن اس وقت تک یہ گروہ پوری طرح سامنے نہ تھا۔ اس سورہ میں یہ بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ اس گروہ کا نظریہ بعینہٖ وہی ہے جو آج وحدتِ ادیان سے پیش کیا جا رہا ہے۔

کہ ایک مرتبہ اسلام کو جڑ پیڑ ہی سے اکھاڑ کے پھینک دیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی کھلم کھلا اپنی دشمنی کا اعلان کر دیا۔

اس طرح یہ دونوں ہی گروہ کھلم کھلا اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کی راہ پر چل پڑے اور انہوں نے طرح طرح کی چالوں سے مسلمانوں کے ذہنوں میں شبہات و شکوک بھرنے شروع کئے تاکہ جس طرح وہ خود فرقوں اور گروہوں میں بٹ چکے ہیں اسی طرح مسلمان بھی اپنی وحدت ویکجہتی کھو کر پراگندہ ہو جائیں اور ان کی طاقت ختم ہو جائے۔ ان حالات نے تقاضا کیا کہ اہل کتاب اور مسلمانوں دونوں کے سامنے دین کی یہ حقیقت واضح کی جائے کہ اللہ کی طرف سے لوگوں کو کئی دین نہیں ملے ہیں بلکہ ایک ہی دین ملا ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اس دین میں تقسیم اور تجزیہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس کے کچھ حصے کو تو مانا جائے اور کچھ کو نہ مانا جائے بلکہ بیک وقت اس کے کل کو ماننا یا کل کو چھوڑنا ہے۔ اس دین کا مطالبہ ہر حالت میں اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام کی فرمانبرداری ہے، خواہ حالات نرم ہوں یا سخت اور خواہ راہ ہموار نظر آ رہی ہو یا آزمائشوں اور فتنوں نے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہوں، حق بہر حال حق ہے، وہ بعض حالات میں مخفی تو ہو جاتا ہے جس طرح چھلکے کے اندر مغز لیکن معدوم نہیں ہوتا۔ اس طرح کے حالات میں وہی لوگ ثابت قدم رہتے ہیں جن کے ایمان اور علم میں پختگی ہوتی ہے۔ جو حق سے بے خبر ہوتے ہیں ان کے قدم اکھڑ جاتے ہیں۔

غزوہ احد بھی اسی طرح کا ایک امتحان بن کر لوگوں کے سامنے آیا۔ جس طرح غزوہ بدر کی نوعیت ایک فرقان کی تھی جس نے حق اور باطل کو الگ الگ کر دیا اسی طرح غزوہ احد کی حیثیت ایک آیت متشابہ کی تھی جس کے باطن میں حکمت تھی لیکن اس کا ظاہر کمزور لوگوں کے لئے آزمائش بن گیا چنانچہ اس نے پختہ فکر و پختہ ایمان مسلمانوں کو چھانٹ کر ان لوگوں سے بالکل الگ کر دیا جن کے دلوں میں کجی اور دماغوں میں فتنہ جوئی تھی۔

یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ اتری چنانچہ اس میں ان تمام خامیوں اور گمراہیوں پر تبصرہ ہے جو اس وقت نمایاں ہوئیں، عام اس سے کہ وہ مسلمانوں سے ظاہر ہوئیں یا اہل کتاب سے۔ اس میں شک اور تذبذب کی ضلالت بھی واضح کی گئی ہے جس میں اہل کتاب مبتلا تھے اور اس اختلاف و عدم اطاعت کے انجام بد پر بھی تبصرہ ہے جس کا اظہار منافقوں اور کمزور قسم کے مسلمانوں سے ہوا تھا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو ان تمام چالوں سے آگاہ کیا گیا ہے جو ان کو زک پہنچانے

کے لئے ان کے دشمن چل رہے تھے اور احد کی شکست سے ان کو جو بددلی ہوئی تھی اس کو نہایت مؤثر انداز میں دور کیا گیا۔ اس پہلو سے غور کیجئے تو آپ محسوس کریں گے کہ جس طرح سورہ بقرہ سورۂ بدر ہے اسی طرح یہ سورہ آل عمران سورۂ احد ہے۔ مزید غور کیجئے تو یہ بات بھی واضح ہو گی کہ بقرہ میں ایمان کی حقیقت واضح کی گئی ہے اور اس سورہ میں اسلام کی۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بقرہ میں اللہ کے آخری رسولؐ پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور اس سورہ میں اسلامی نظام اور اللہ کی حکومت میں داخل ہونے کی دعوت۔

ان دونوں سورتوں کے موضوع اور عمود سے متعلق یہ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ بقرہ میں ایمان کا پہلو نمایاں ہے اور اس سورہ میں اسلام کا۔ اس حقیقت کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ہمیں رہنمائی ملتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ نمازوں میں کبھی کبھی ایک رکعت میں بقرہ میں سے آیت ایمان پڑھتے اور دوسری رکعت میں آل عمران میں سے آیت اسلام۔ یہ گویا ایک لطیف اشارہ ہوتا اس بات کی طرف کہ ان دونوں سورتوں میں موضوع اور مقصود کی حیثیت کن مضامین کو حاصل ہے۔ علاوہ ازیں بقرہ کا خاتمہ ایک ایسی آیت پر ہوا ہے جو ایمان کے باب میں ایک نہایت جامع آیت ہے۔ 'امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون، الایہ' اور پھر اس کا خاتمہ کامل اطاعت الٰہی کے مضمون پر ہوتا ہے تاکہ ہم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ایمان کا لازمی ثمرہ اسلام ہے، جہاں صحیح ایمان موجود ہوگا اس سے لازماً اسلام ظہور میں آئے گا۔ اسی طرح بقرہ کے خاتمے کی آیت نے آل عمران کے ساتھ اس کے ربط کو خود واضح کر دیا۔

دوسرا پہلو ان دونوں کے درمیان امتیاز کا یہ ہے کہ سورہ بقرہ میں زیادہ تر خطاب یہود سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کی حیثیت سے اصلی مقام انہی کو حاصل تھا۔ نصاریٰ کی حیثیت محض ایک ضمنی فرقے کی تھی چنانچہ قرآن نے بقرہ میں ان سے خطاب کیا بھی ہے تو وہ سرسری نوعیت کا ہے۔ البتہ آل عمران میں ان سے براہ راست خطاب کیا ہے اور بحث کا زیادہ حصہ انہی سے متعلق ہے۔ سورہ کی تمہید بھی ایک جامع نوعیت کی ہے جو یہود و نصاریٰ دونوں کے لئے موزوں ہے پھر اس سے آگے جو مضمون شروع ہوا ہے وہ تدریجی طور پر نصاریٰ کی تردید میں نمایاں ہوتا گیا ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ بقرہ میں استدلال زیادہ تر ایسے امور فطرت سے ہے جو کفار اور اہل کتاب

دونوں پر یکساں حجت ہو سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف آل عمران میں زیادہ تر استدلال صفات الٰہی یا ایسے مسلمات سے ہے جو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہیں۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ ان دونوں ہی سورتوں میں اہل کتاب کو سخت توبیخ فرمائی ہے لیکن انداز توبیخ دونوں میں الگ الگ ہے۔ بقرہ میں توبیخ براہ راست ہے برعکس اس کے آل عمران میں ان کو براہ راست خطاب کرنے کے بجائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ ان کو یہ یہ تہدیدات پہنچا دو۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام ہو جانے کے بعد یہ لوگ لائق خطاب نہیں رہے، اب خطاب کے اہل صرف پیغمبر اور اہل ایمان ہی ہیں۔

سورتوں کی تقدیم و تاخیر کے وجوہ

(تقدیم و تاخیر کے وجوہ)

ان دونوں سورتوں کے موضوع، ان کے زمانہ نزول کی خصوصیات، ان کے اسلوب بیان کے امتیازات پر ہم نے یہ جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مضامین کے اشتراک کے باوجود ان دونوں میں نسبت اس نوعیت کی ہے کہ مصحف میں تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے ان کی یہی ترتیب ہونی چاہیئے تھی جو ہے۔ یہاں بقرہ کے آل عمران پر مقدم رکھنے کے مندرجہ ذیل وجوہ بالکل واضح ہیں:۔

ایمان اسلام کی بنیاد ہے، جس طرح علم عمل کی بنیاد ہے۔

یہود، نصاریٰ سے قدیم ہیں اس وجہ سے ضروری ہوا کہ پہلے یہود پر حجت تمام کی جائے۔

دلائل فطرت سے استدلال صفات الٰہی سے استدلال کے مقابل میں زیادہ واضح، زیادہ قدیم، زیادہ وسیع ہے اس وجہ سے قرآن نے پہلے اس کو استعمال کیا۔

علیٰ ہذا القیاس حضرت آدم اور حضرت ابراہیم علیہما السلام چونکہ انبیا متقدمین میں سے ہیں اس وجہ سے یہ مناسب ہوا کہ پہلے ان کے عہد و میثاق کا حوالہ دیا جائے اور اس سے استدلال کیا جائے۔ چنانچہ بقرہ میں ان کے عہد کا حوالہ دیا۔ بعد کی سورہ میں دوسرے انبیاء کے عہد کا ذکر ہوا۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ ترتیب میں سورتوں کی تقدیم و تاخیر صرف ان کی ظاہری بڑائی چھوٹائی پر مبنی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا تعلق مضامین و مطالب سے ہے۔ معانی کی ترتیب کے لحاظ سے حکمت جس ترتیب کی مقتضی ہوئی ہے

وہ ترتیب قرآن میں اختیار فرمائی گئی ہے۔[1] البتہ اگر کہیں معانی کے اعتبار سے دو سورتیں ایک ہی درجے اور ایک ہی مزاج کی ہوئی ہوں تو ممکن ہے، وہاں مجرد طول و حجم کی بنا پر ایک کو دوسرے پر مقدم کر دیا گیا ہو۔ لیکن یہ بات محض قیاس کے حد تک صحیح قرار دی جا سکتی ہے، ورنہ ایسے مواقع پر بھی گمان یہی ہوتا ہے کہ کوئی گہری معنوی حکمت ایک کو دوسرے پر مقدم کرنے کا باعث ہوئی ہوگی اگرچہ وہ حکمت ہماری سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔

(سورہ کے مطالب کا باہمی ربط)

یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے اس کا تعلق سورہ کے موضوع، اس کے ظاہری نظام اور سابق سورہ کے ساتھ اس کے ربط سے ہے۔ اب ہمیں چند باتیں اس کے اندرونی نظام اور اس کے مختلف اجزا کے باہمی ربط و تعلق کے بابت بھی کہنی ہیں۔

اس سورہ پر جو شخص بھی تامل کی نظر ڈالے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ یہ دو بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ اس کے نصف اول میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اثبات اور اہل کتاب خصوصاً نصاریٰ کی گمراہیوں کا بیان ہے اور اس کے دوسرے نصف میں مسلمانوں کو اہل کتاب کی ان گمراہ کن چالوں سے خبردار کیا گیا ہے جو وہ ان کو راہ حق سے ہٹانے کے لئے اختیار کر رہے ہیں یا اختیار کرنے والے ہیں۔ ساتھ ہی ان کو اللہ کی رسی مضبوطی سے تھامے رہنے، اطاعت پر جمے رہنے، جہاد کرنے اور امتحان کے مواقع پر انتشار و اختلاف سے بچنے کی تاکید فرمائی کہ اسی طرح وہ اسلام کی پیروی کا صحیح حق ادا کر سکیں گے اور نرمی و سختی دونوں صورتوں میں اللہ کی اطاعت پر قائم رہ سکیں گے۔ اگر وہ ان باتوں کی خلاف ورزی کریں گے تو ان کا حشر بھی وہی ہوگا جو موسیٰ علیہ السلام کی امت کا ہوا کہ انہوں نے اپنے پیغمبر کی نافرمانی کی تو چالیس سال تک صحرا ہی میں بھٹکتے رہ گئے۔

اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے نصف اوّل کی حیثیت تمہید کی ہے اور نصف ثانی کی حیثیت مقصود کی۔ اس روشنی میں پوری سورہ کی تلاوت کیجئے تو آیات کا باہمی نظم سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی اور اس تمہید سے یہی مقصود یہی ہے۔ رہا آیات کا باہمی نظم اور ان کے معانی کی وضاحت تو یہ چیز اس وقت سامنے آئے گی جب ہم سورہ بقرہ کی طرح اس کے اجزا کو بھی الگ الگ مجموعوں کی شکل میں لے کر ان کی تفسیر کریں گے۔ چنانچہ اب ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق کی رہنمائی میں اس سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۔

[1] یہ تمہیدی بحث بیشتر استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے ماخوذ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝۱ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝۲ نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا
لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۝۳ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ
الْفُرْقَانَ ۝۴ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴
اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰى عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ۝۵ هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ
كَیْفَ یَشَآءُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۶

شروع خدائے رحمان ورحیم کے نام سے

یہ الم ہے۔ اللہ ہی معبود ہے، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی، زندہ اور قائم رکھنے والا۔ اس نے تم پر کتاب اُتاری حق کے ساتھ تصدیق کرتی ہوئی اس کی جو اس کے آگے سے موجود ہے۔ اور اس نے تورات اور انجیل اُتاری اس سے پہلے لوگوں کے لئے ہدایت بنا کر۔ اور پھر فرقان اُتارا۔ بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے۔ اللہ سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں۔ وہی ہے جو تمہاری صورت گری کرتا ہے رحموں کے اندر جس طرح چاہتا ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی، وہ غالب اور حکیم ہے۔ (۱-۶)

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تاویل

الٓمٓ۔ سورہ بقرہ کی تفسیر میں حروفِ مقطعات پر ایک جامع بحث ہم کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے

اس باب میں استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر بھی پیش کر دیا ہے ۔ اس کے سوا کوئی نئی چیز اس سلسلے میں ہمارے سامنے ایسی نہیں آئی ہے جو یہاں قابلِ ذکر ہو۔

' اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (۲) اس آیت میں جو اسمائے حسنیٰ مذکور ہیں سب کی تحقیق گزر چکی ہے۔ بعض کی تفسیر سورۂ فاتحہ میں، بعض کی سورہ بقرہ میں۔

صفات حیات و قیومیت کے اسرار و مقتضیات

یہ امر جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، ملحوظ رہے کہ اس سورہ میں استدلال بیشتر صفاتِ الٰہی سے ہے۔ صفاتِ الٰہی میں سب سے پہلے صفات حیات و قومیت کو لیا ہے۔ ان دونوں صفتوں کے اسرار و حقائق پر ہم آیت الکرسی کے اسرار و حقائق کے ضمن میں گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں ان کا اعادہ باعثِ طوالت ہو گا۔ یہاں موقع کلام کی مناسبت سے ان صفات کا حوالہ کتاب الٰہی کی ضرورت کے اثبات کے پہلو سے ہے۔ چنانچہ بعد کی آیات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ایک زندہ خدا ہے تو ناگزیر ہے کہ وہ سب کچھ دیکھتا سنتا ہے، ہماری دعائیں، فریادیں اس تک پہنچتی ہیں ہمارے اعمال و افعال اس کی نظر میں ہیں۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ ہماری دعائیں اپنی حکمت کے مطابق قبول فرماتا ہے اور ہمارے اعمال پر وہ ایک دن جزا اور سزا بھی دے گا۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ بندے اپنی زندگی میں وہ رویہ اختیار کریں جو اسے پسند ہو۔ یہ چیز اس بات کی مقتضی ہے کہ بندوں میں اس بات کی جستجو ہو کہ کون سے اعمال خدا کو پسند ہیں، کون سے ناپسند، تاکہ وہ اس کی اطاعت و ہدایت کی راہ اختیار کر کے سعادت کا مقام حاصل کر سکیں اور حقیقی زندگی کے چشمۂ حیواں سے فیضیاب ہو سکیں۔

اہلِ کتاب " خداوند خدا، زندہ خدا " کی تعبیر سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان کے انبیاء کے صحیفوں میں بکثرت یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ جہاں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کے علم اور اس کی غیرت کا اظہار ہوا ہے بالعموم اس کے لئے " زندہ خداوند " ہی کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ نصاریٰ اگرچہ اپنے زعم کے مطابق ایک مصلوب خدا کی پرستش کرتے ہیں لیکن وہ بھی " زندہ خدا " کی تعبیر سے ناآشنا نہیں تھے اس وجہ سے یہ بات بداہۃً ان کے خلاف جاتی ہے کہ ایک طرف تو وہ زندہ خدا کا تصور رکھتے ہیں اور دوسری طرف اس کا مصلوب ہونا بھی مانتے ہیں۔

اسی طرح " قیوم " کی صفت بھی انبیاء کے صحیفوں میں بار بار مذکور ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آسمان وزمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے سب اللہ ہی کے حکم اور اس کی قدرت سے قائم ہے۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ کی ان بدیہی صفات میں سے ہے جن پر عقلاً بھی ایمان لانا ضروری ہے اور انبیاء کے صحیفوں کی رو سے بھی۔ نصاریٰ بھی ان صحیفوں پر ایمان کے مدعی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ حضرت مسیحؑ کی اُلوہیت کے قائل ہیں۔ اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ جب تم خود اقرار کرتے ہو کہ حضرت مسیحؑ بھوک پیاس محسوس کرتے تھے، غذا اور پانی کے محتاج تھے، بغیر ان چیزوں کے وہ اپنی ہستی کو قائم رکھنے پر قادر نہ تھے تو پھر وہ خدا کس طرح ہوئے، جبکہ خدا کے لئے تمہارے اپنے انبیاء کے ارشاد کے بموجب قیوم ہونا ضروری ہے؟ یا یہ سوال کیا جائے کہ جب تمہاری اپنی انجیلوں سے ثابت ہے کہ حضرت مسیحؑ مصائب و شدائد پیش آنے پر روئے، ان کا دل تنگ ہوا اور سولی پر انہوں نے فریاد کی تو پھر وہ آسمان وزمین کے تھامنے والے اور قائم رکھنے والے کیسے ہو سکتے ہیں؟ تو ان سوالوں کے جواب میں ان کے پاس ضد اور کٹ حجتی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یہاں قیوم کی صفت کا حوالہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ہمیں ہدایت بخشے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ واحد، ہمارا پروردگار، جس طرح ہمارا پیدا کرنے والا اور ہمیں زندگی بخشنے والا ہے اسی طرح وہ، جیسا کہ آیت الکرسی میں ارشاد ہوا، اپنی خلق کو قائم رکھنے والا بھی ہے اور اس کے لئے اس نے ہر قسم کے اسباب و وسائل پیدا کئے ہیں۔ پھر جب اس نے ہماری معیشت کے لئے یہ کچھ سامان کئے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ہماری اجتماعی زندگی کے لئے وہ چیز نہ دے جو ہمارے قیام و بقا کی ضامن ہو سکے درآں حالیکہ یہ چیز ہماری خلقت کی اصل غایت ہے۔ چنانچہ یہی چیز قیام عدل و قسط کی اصل اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے شرائع و احکام کے نزول کی بنیاد بنی اس لئے کہ اس کے بغیر فطرت انسانی ارتقا کے اس درجے کو حاصل نہیں کر سکتی تھی جو اس کے وجود کے اندر مضمر ہے۔

یہ قیومیت اس بات کی بھی مقتضی ہوئی کہ خدائے قیوم وکارساز اس امر کی بھی نگرانی رکھے

کہ جب بندے اپنی خودمختاری اور سرکشی سے کام لے کر اس کے نظام عدل کو بالکل مٹا دینے کی کوشش کریں تو وہ اپنے ایسے بندوں کو بھی اٹھاتا رہے جو اس کو ازسرنو بحال کرنے کے لئے اپنی مساعی صرف کریں۔ چنانچہ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک اللہ تعالیٰ نے دنیا کو عدل وحق اور اپنی سیدھی راہ پر استوار رکھنے کے لئے اپنے بے شمار نبی اور رسول بھیجے اور خاتم الانبیاء پر دین کی تکمیل کر دینے اور کتاب الٰہی کو ہر قسم کی دست اندازیوں سے محفوظ کر دینے کے بعد اس مقصد کے لئے یہ اہتمام فرمایا کہ ہر دور میں اس اُمت کے اندر ایک ایسا گروہ، خواہ وہ کتنا ہی قلیل التعداد ہو، پیدا ہوتا رہے گا جو خود حق و عدل پر قائم اور دوسروں کو اس عدل وحق کے قائم کرنے کی دعوت دیتا رہے گا۔ اس حقیقت کی وضاحت حدیثوں میں بھی ہوئی ہے اور اس کی طرف بعض لطیف اشارات اس سورہ میں بھی آرہے ہیں جن کی طرف ہم آگے ان شاء اللہ موزوں مقامات میں توجہ دلائیں گے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ ۗ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ﴿٣﴾

"حق" کے معنی کی تحقیق تفسیر سورہ بقرہ کے شروع میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے مختلف معانی میں سے "قول فیصل" مراد ہے۔ یعنی وہ بات جو نزاع و اختلاف کا فیصلہ کر دے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو جو کتاب دی گئی تھی اس میں انہوں نے اختلافات پیدا کر دیئے جس کے سبب سے اصل حقیقت گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس گم شدہ حقیقت کو واضح کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن اتارا تاکہ لوگ اللہ کے اصل دین سے بہرہ مند ہوں اور اختلافات و نزاعات کی بھول بھلیاں سے نکل کر دین کی اصلی شاہراہ پہ آ جائیں۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ پر بھی تفصیلی بحث سورہ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ قرآن کے مصدقا لما بین یدیہ ہونے کے ایک مشہور معنی تو یہ ہیں کہ یہ بنیادی طور پر پچھلے صحیفوں کی تمام صحیح تعلیمات کی تصدیق کرتا ہے، صرف ان باتوں کی تردید کرتا ہے جو ان میں

ملاوٹ کرنے والوں کی طرف سے ملا دی گئی ہیں۔ قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں کی یہ ہم آہنگی و ہم رنگی اس بات کی صاف شہادت ہے کہ یہ سب ایک ہی آفتاب حق کی شعاعیں اور ایک ہی منبع انوار کے پرتو ہیں۔ دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ قرآن اور اس کے حامل کی صفات پچھلے صحیفوں کی پیشین گوئیوں میں مذکور رہیں، یہ پیشین گوئیاں اب تک اپنے مصداق کی منتظر تھیں، قرآن کے نزول اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ان کی تصدیق ہوئی۔ یہ قرآن کے حق ہونے کی ایک بہت بڑی شہادت ہے اور ساتھ ہی اس سے ان صحیفوں کی بھی تصدیق ہو رہی ہے کہ ان میں جو پیشین گوئیاں وارد تھیں وہ سچی ثابت ہوئیں۔ اس پہلو سے قرآن سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے خیر مقدم کا سزاوار تھا جو اگلے صحیفوں پر ایمان کے مدعی تھے کہ اصلاً قرآن کے ظہور سے سب سے زیادہ انہی کے سر اونچے ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب سے اس کا انکار کیا۔

وَاَنۡزَلَ التَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ مِنۡ قَبۡلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ الآیۃ۔ یہ اوپر والے ٹکڑے کے اجمال کی تفصیل ہے جس سے قرآن کے اتارے جانے کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ حیّ و قیوم ہے اس وجہ سے اس نے ہماری زندگی کی رہنمائی اور ہمیں عدل و قسط پر استوار رکھنے کے لئے قرآن کو قول فیصل بنا کر اتارا ہے۔ اس سے پہلے اس نے لوگوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل نازل فرمائیں لیکن ان کے پیروؤں نے ان میں تحریف اور ان کے بعض حصوں کو فراموش کر کے ان میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیئے جس کے سبب سے حق و باطل میں امتیاز ناممکن ہو گیا۔ یہ صورت حال مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ قرآن کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بنا کر اتارے۔ چنانچہ اس نے یہ کتاب نازل فرمائی۔ اب جو لوگ اس کتاب کا انکار کریں گے ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت عذاب ہے اس لئے کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے اس نظام عدل و قسط کے دشمن ہیں جو اس کی مخلوق کی صلاح و فلاح اور اس کی دنیا و آخرت دونوں کی سعادت کے لئے ضروری ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو چھوڑ دے، ان کی عدل دشمنی کی ان کو سزا نہ دے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس نے اپنی دنیا کو تباہی کے لئے چھوڑ دیا اور اس کے بقا سے

اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی درانحالیکہ اس کی صفت، جیسا کہ اسی سورہ میں آگے ذکر آئے گا، قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ہے۔ اس قوامیت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اس قسط کے دشمنوں سے انتقام لے اور ان کو واجبی سزا دے۔ وہ عزیز یعنی غالب اور قدرت والا ہے، کمزور و ناتواں نہیں ہے کہ کوئی اسے بے بس کر دے، اسی طرح وہ انتقام والا ہے یعنی عدل و قسط کے معاملے میں غیور ہے، سرد مہر اور بے احساس نہیں ہے کہ ان کی پامالی پر راضی ہو جائے۔ یہ اس کی انہی صفات کا ظہور ہے کہ جن قوموں نے اس کے قائم کردہ قسط کو مٹایا ہے، ایک خاص حد تک ان کو مہلت دینے کے بعد اس نے ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا ہے اور جب جب اس کے شرائع و احکام کو نابود کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس نے ان کو از سر نو تازہ کرنے اور سنوارنے کا اہتمام فرمایا ہے۔ عدل و قسط کے قیام و بقا کے لئے اپنی اسی سنت کو یہاں انتقام سے تعبیر فرمایا ہے

علم پر صفات الٰہی سے استدلال

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (۵) هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۶) اوپر والی آیت میں کتاب الٰہی کے مخالفین یا بالفاظ دیگر عدل و قسط کے ہادمین کے لئے جو سزا مذکور ہوئی ہے یہ اس کی دلیل ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدا کی اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے وہ بے خبر رہتا ہے۔ اس سے کوئی بات بھی مخفی نہیں رہتی، خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، اور خواہ زمین میں پیش آئے یا آسمانوں میں، خدا کا علم ہر چیز اور ہر جگہ کو محیط ہے۔ اور محیط کیوں نہ ہو، اسی نے تو سب کو پیدا کیا اور وہی ہے جو رحموں کے اندر صورت گری فرماتا ہے تو جس نے پیدا کیا اور جس نے صورت گری فرمائی کیا وہ بھی بے خبر ہو سکتا ہے۔ أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (کیا جس نے پیدا کیا وہ بھی نہ جانے گا)

اس کے بعد توحید اور خدا کی صفات میں سے عزیز اور حکیم کا حوالہ دیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ محیط کل علم رکھنے والی ہستی اگر قیام عدل و قسط کا اہتمام نہ کرے تو اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس کو عزت و قدرت حاصل نہیں ہے یا عزت و قدرت تو حاصل ہے لیکن اس کو اپنے کاموں میں کسی حکمت و مصلحت کی کوئی پروا نہیں، بس ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے، خیر ہو شر، ظلم ہو یا انصاف اس سے اسے کچھ بحث نہیں، دونوں ہی چیزیں اس کی نظر میں یکساں۔ یہ خیال بالبداہت باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ عزیز بھی ہے اور حکیم بھی، اسے ہر چیز پر قدرت بھی ہے

ہے اور اس کے ہر کام میں عدل و حکمت بھی ہے اور ساتھ ہی وہ ہر چیز سے باخبر بھی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں سے انتقام نہ لے گا جو اللہ کی اس کتاب کا انکار کریں گے جو اس نے دنیا میں از سر نو حق و عدل کے آثار و اعلام کو اجاگر کرنے کے لئے نازل فرمائی ہے ؂

مقالات

مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

خبرِ آحاد کی حُجّیت کا مسئلہ

خبر واحد کی حجیت و استناد میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف نہیں۔ صحابہ کرام، تابعین، سلف صالحین فقہاء امصار اور ائمہ و مجتہدین نے اسے بطور حجت تسلیم کیا ہے اور جب بھی کسی زمانہ میں اہل اہوا نے اس میں تردد ظاہر کیا تو اس زمانہ کے ائمہ و مجتہدین نے عقلی و نقلی دلائل سے اس کا بھرپور رد کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انکار اور عدم حجیتِ حدیث کا فتنہ کبھی سر نہ اٹھا سکا اور نہ کبھی امت کی کسی قابل ذکر تعداد نے اس کی حمایت کی۔ بعض فرقوں نے خبر واحد کی حجیّت میں ضرور کلام کیا ہے لیکن بجز چند افراد کے عام طور پر ان فرقوں میں بھی ان کا ہمنوا نہ نکلا۔ یہی حال آج بھی ہے کہ ایک قلیل گروہ کے علاوہ الحمد للہ اب بھی مسلمانوں میں حدیثوں کے مستند ہونے کے بارہ میں کوئی غلط فہمی نہیں۔

غرضیکہ یہ مسئلہ امت میں متفق علیہ رہا ہے اور جمہور علماء و محدثین نے اس کی حجیّت کے متعلق عقلی و نقلی دلائل کا انبار لگا دیا ہے جنہیں اکٹھا کیا جاتے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جاتے۔ اختصار کے خیال سے امام شافعیؒ کے "الرسالہ" سے چند ضروری اور صریح دلائل نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:-

۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:-

نضر اللہ عبداً سمع مقالتی فحفظها ووعاها واداها فرب حامل فقه غیر فقیه ورب حامل فقه الی من هو افقه منه۔	اللہ اس بندہ کو تر و تازہ رکھے جس نے میری بات سنی اور اُسے یاد رکھا اور اچھی طرح محفوظ کیا، بعض حاملین فقہ و فہم بے سمجھ ہوتے ہیں اور بعض اسے ان لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں جو ان سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں۔

اس حدیث میں حدیث کی روایت، اسماع، حفظ و ضبط اور اس کی نشر و اشاعت کی ترغیب و تلقین
ہے اور خبر واحد کی حجیت کا ثبوت بھی۔

۲۔ عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ ایک شخص نے روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لیا اور اس
کے بعد وہ سخت فکر مند اور غمگین ہوا اور اپنی بیوی کو اس کے متعلق دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ بیوی نے
ام المؤمنین ام سلمہؓ سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ بھی روزہ کی حالت میں ایسا کرتے
ہیں۔ لیکن شوہر کو یہ سنکر تشفی نہ ہوئی اور اس نے کہا ہم لوگ تو رسول اللہ کی طرح نہیں ہیں کیونکہ خدا
نے آپ کے لئے جو کچھ چاہا حلال کیا ہے۔ چنانچہ اس کی بیوی پھر ام سلمہؓ کے پاس آئیں تو وہاں رسول اللہ
بھی موجود تھے۔ آپ نے دریافت کیا کہ یہ عورت کس لئے آئی ہے؟ انہوں نے صورت حال بتائی تو
آپ نے فرمایا۔ الا اخبرتها انی افعل ذلك (تم نے اسے یہ کیوں نہیں بتایا کہ میں بھی ایسا کرتا ہوں)
حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا کہ میں نے تو اس سے یہ کہہ دیا تھا مگر اس کے شوہر کی پریشانی اس وجہ
سے اور بڑھ گئی اور وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ کی طرح نہیں ہیں، آپ کے لئے تو خدا نے جو چاہا حلال کر
دیا ہے۔ رسول اللہؐ یہ سنکر برہم ہوئے اور آپ نے فرمایا۔ انی والله اتقاکم لله و اعلمکم
بحدوده۔

اس روایت میں رسول اللہؐ کا حضرت ام سلمہؓ سے یہ فرمانا کہ الا اخبرتها انی افعل
ذلك، اس بات کی صریح دلیل ہے کہ مجرد ایک شخص بلکہ ایک عورت کی روایت بھی کافی اور مستند ہے
ورنہ آپ کبھی ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کو ایسی بات کی خبر دینے کا حکم نہ دیتے جو ناقابل ثبوت
حجت ہوتی۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ لوگ قبا میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص
نے آکر اطلاع دی کہ رسول اکرمؐ پر یہ وحی نازل ہوئی ہے کہ لوگ کعبہ کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھیں
اس لئے تم لوگ ادھر رُخ کر لو۔ چنانچہ یہ خبر سنکر تمام مصلیوں نے جو شام (بیت المقدس) کی سمت
نماز پڑھ رہے تھے ادھر سے رُخ موڑ کر کعبہ کی طرف کر لیا۔

غور فرمائیے اہل قبا انصار کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو شرف سبقت و تقدم کے علاوہ
بصیرت میں بھی ممتاز تھا۔ وہ لوگ اس طرف رُخ کرکے نماز پڑھ رہے تھے جس کو خدا نے

فرض قرار دیا تھا۔ اس لئے قبلہ کے متعلق وہ خدا کے حکم اور فریضہ کو اسی صورت میں ترک کر سکتے تھے۔ جب کوئی فیصلہ کن ثبوت اور قابل حجت خبر انہیں مل جاتی۔ لیکن انہوں نے تحویل قبلہ کے متعلق خدا کی وحی و تنزیل نہ تو خود سنی تھی، نہ رسول اللہ سے مل کر اس کی کوئی تصدیق کی اور نہ ایک کثیر جماعت نے اس کے متعلق انہیں اطلاع دی تھی لیکن ان سب کے باوجود صرف ایک معتبر اور ثقہ آدمی کے اطلاع دے دینے کی وجہ سے انہوں نے قبلہ تبدیل کر دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خبر واحد حجت اور مستند ہے کیونکہ ان کے اس عمل پر نہ تو کوئی اعتراض ہوا اور نہ رسول اللہ نے اسے ناپسند کیا اور نہ ہی کوئی وحی الٰہی اس کے متعلق نازل ہوئی۔

۴۔ انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ابو عبیدہ بن جراح، ابو طلحہ اور ابی بن کعب کو شراب پلا اور کھجوریں کھلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آکر بتایا کہ شراب حرام ہو گئی ہے، یہ اطلاع پاکر ابو طلحہ نے مجھ سے شراب کے مٹکے توڑ ڈالنے کے لئے کہا اور میں نے انہیں توڑ ڈالا۔

اس روایت میں آنحضورؐ کے نہایت مقرب اور جلیل القدر اصحاب کا ذکر ہے اور ان میں سے ہر ایک کی فضیلت اور تقدم مسلم ہے۔ یہ لوگ شراب پی رہے تھے جو اس وقت تک حلال تھی لیکن ایک شخص سے اس کی حرمت کی اطلاع پاکر سب لوگ نہ صرف اس کے پینے سے باز آتے بلکہ مٹکے بھی توڑ ڈالتے ہیں اور ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ جب تک ہم خود رسول اللہ سے معلوم یا ایک کثیر جماعت سے سن نہ لیں گے اس وقت تک شراب کو حرام نہ سمجھیں گے۔

۵۔ ایک روایت میں ہے کہ لوگ منیٰ میں تھے کہ حضرت علیؓ ایک اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لاتے اور کہا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ کھانے پینے کے دن ہیں اس لئے ان دنوں میں کوئی شخص روزہ نہ رکھے۔ چنانچہ لوگ ان کے پیچھے ہو گئے اور وہ اونٹ پر چیخ چیخ کر یہ اعلان کرتے تھے۔

غور فرمائیے کہ رسول اللہ نے محض ایک سچے اور باوثوق شخص کو بھیجنے پر صرف اسی لئے تو اکتفاء کیا تھا کہ جن لوگوں کو خبر دینی تھی ان کے اور آپ کے نزدیک اس طرح کے ایک آدمی کی بھی اطلاع کافی تھی۔ اگر خبر واحد حجت نہ ہوتی تو آپ کے ساتھ بے شمار حجاج تھے، آپ ان میں سے ایک کثیر تعداد کو بھیج بھی سکتے تھے یا خود تشریف لے جاکر براہِ راست لوگوں کو بتا سکتے تھے۔ لیکن آپ نے تو حضرت علیؓ کو اس لئے بھیجا کہ مجرد ایک شخص کی خبر اور اطلاع بھی حجت اور کافی تھی۔

۶۔ سنہ ۹ھ میں آنحضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحج مقرر کیا۔ اس موقعہ پر مختلف مقامات شہروں اور قبیلوں کے لوگ حج کے لئے جمع ہوئے تھے اور انہیں حضرت ابوبکرؓ نے حج کے احکام و مناسک اور دوسری ہدایاتِ نبوی سے باخبر کیا۔ اسی سال حضرت علیؓ کو بھی بھیجا اور انہوں نے نحر کے دن علم مجمع میں سورۂ برات کی آیات سنائیں جن میں کچھ اوامر بھی تھے اور نواہی بھی۔

ان دونوں بزرگوں کا انتخاب اس لئے عمل میں آیا تھا کہ یہ فضل و تقویٰ اور صدق و امانت کے لحاظ سے ممتاز تھے اور اہل مکہ ان کے فضائل و محامد سے پوری طرح باخبر تھے۔ باقی جو لوگ ان سے ناواقف تھے انہیں ان کے متعلق اطلاع دینے والے موجود تھے۔ اسی لئے آپ نے ان لوگوں کو حج کے آداب و مناسک سکھلانے کے لئے الگ الگ بھیجا۔ اگر خبرِ واحد حجت نہ ہوتی تو آپ ہرگز حضرت ابوبکرؓ اور صرف حضرت علیؓ کو بھیجنے پر اکتفا نہ کرتے۔

۷۔ رسول کریم صلعم نے مختلف مقامات میں متعدد اشخاص کو عامل بنا کر بھیجا مثلاً قیس بن عاصم، زبرقان بن بدر اور ابن نویرہ وغیرہ کو ان کے اپنے اپنے قبیلوں میں اس لئے بھیجا کہ وہ ان کے صدق و دیانت سے واقف تھے۔ اسی طرح بحرین کا وفد آیا تو ان کے کہنے کے مطابق سعید بن عاص کو وہاں اور معاذ بن جبل کو یمن، حرام و حلال اور امر و نہی کی تعلیم دینے کے لئے بھیجا۔ اگر خبرِ واحد قابل قبول اور لائق احتجاج نہ ہوتی تو کیوں آنحضورؐ صرف ایک ایک آدمی بھیجنے پر اکتفا کرتے، نیز زکوٰۃ دینے والوں نے بھی قضاۃ و عاملین سے یہ اعتراض نہیں کیا کہ وہ تنہا یہ احکام بیان کر رہے ہیں۔ اور محض ایک آدمی کے کہنے سے زکوٰۃ ہم نہیں دے سکتے۔ تا آنکہ خود رسول اللہؐ آکر ہمیں یہ نہ بتاویں، یا کچھ اور لوگ بھی اس کی خبر نہ دیں۔ اسی پر امراء سرایا کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے جنہیں آپؐ روانہ کرتے تھے۔

۸۔ اسی طرح آپ نے حاکموں اور والیوں کے پاس بھی قاصدین کے ذریعہ احکام اور فرامین بھیجے اور انہوں نے بلا تامل ان کو مان لیا اور کسی نے یہ نہیں کہا کہ متعدد اشخاص کی اطلاع کے بغیر تو ہم یہ فرامین تسلیم نہ کریں گے۔ آپ کے بعد آپ کے خلفاء کا بھی یہی طریقہ رہا۔

۹۔ سعید بن مسیبؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ دیت عاقلہ کو ملے گی اور عورت کو شوہر کی دیت سے کوئی حصہ نہ ملے گا۔ لیکن ضحاک بن سفیان نے بتایا کہ آنحضورؐ نے انہیں لکھا تھا اشیم ضبابی کی عورت کو ان کی دیت میں وارث بنایا جائے۔ حضرت عمرؓ نے یہ خبر سنی تو اپنے فیصلہ سے باز آگئے۔

۱۰۔ طاؤس بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ کیا کسی شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جنین کے متعلق کچھ سنا ہے۔ حمل بن مالک نے کھڑے ہو کر کہا کہ میری دو بیویاں تھیں ایک نے دوسرے کو بیلن سے مارا جس کے نتیجہ میں اس کا جنین ضائع ہو گیا۔ اس پر آنحضرتؐ نے ایک غرہ (عبد) کا فیصلہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر یہ روایت نہ ہوتی تو ہم اس کے علاوہ کوئی اور فیصلہ کر دیتے۔

۱۱۔ مجوسیوں سے جزیہ لینے کے متعلق حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی اس روایت پر اعتماد کیا کہ:

سنوا بھم سنۃ اھل الکتاب — ان کے ساتھ اہلِ کتاب کا طریقہ اختیار کرو۔

غور فرمایئے کہ ان روایتوں میں حضرت عمرؓ جیسے فقیہ و مجتہد اور کتاب و سنت کے اداشناس صرف ایک شخص کی خبر پر کس طرح اعتماد و اطمینان کر لیا۔ کیا ان جیسے صاحب فراست اور نکتہ دانِ شریعت سے یہ معاملہ مخفی تھا؟

۱۲۔ حضرت علیؓ کا خبر واحد پر عمل کرنا عام طور سے مشہور و معروف ہے۔ وہ خود فرماتے تھے کہ میں رسول اللہ سے جب کوئی حدیث سنتا تھا تو حسب توفیق اس پر عمل کرتا تھا اور جب کوئی اور شخص مجھ سے حدیث بیان کرتا تو اس سے قسم لیتا اور وہ جب قسم کھا لیتا تو میں اس کی تصدیق کر لیتا تھا۔ یعنی محض ایک شخص کی خبر پہ جب انہیں پورا اطمینان ہو جاتا تو اسے قبول کر لیتے۔ اگر خبر واحد کی حجیت میں کلام ہوتا تو کیا حضرت علیؓ ایسا کر سکتے تھے۔

۱۳۔ مشہور صحابی اور عالم حضرت زید بن ثابت رضؓ نے ایک انصاری عورت کی اس خبر پر عمل کیا کہ حائض طواف وداع کے پہلے ہی روانہ ہو سکتی ہے۔

۱۴۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ صرف نسیئہ میں ربا کے قائل تھے لیکن جب انہیں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت معلوم ہوئی تو انہوں نے اپنا مسلک تبدیل کر لیا اور نقد میں بھی ربا کے قائل ہو گئے۔

۱۵۔ مخابرہ کے متعلق عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے لیکن رافع بن خدیجؓ کی ایک روایت سے جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ آپ نے اس سے منع کیا ہے تو ہم نے اسے

ترک کر دیا۔

یہی حال تمام صحابہ کا تھا وہ صرف ایک شخص کی روایت کو کافی سمجھتے تھے اور جب انہیں کسی دوسرے صحابی کی روایت سے عمل یا قول رسول معلوم ہو جاتا تو وہ اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔ اور کبھی کسی نے اس میں کوئی شبہ نہیں کیا اور نہ یہ کہا کہ جب تک بہت سارے لوگ نہ خبر دیں ہم صرف ایک شخص کی خبر تسلیم نہیں کر سکتے؟ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے جب "الائمة من قریش" یا "الانبیاء یدفنون حیث یموتون" اور "نحن معاشر الانبیاء لانورث ما ترکناه صدقة" وغیرہ روایات سے لوگوں کو باخبر کیا تو سب نے انہیں تسلیم کر لیا اور کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

خبر آحاد کی حجیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ سلف سے لیکر خلف تک کے تمام معتبر علماء اور مجتہدین کے نزدیک اسے قیاس و درایت پر مقدم کیا جائے گا۔

فقدم الجمھور خبر الضابط علی القیاس لان القیاس عرضة الزلل (ارشاد الفحول ۴۹)	جمہور نے ثقہ و ضابط کی روایت کو قیاس پر مقدم کیا ہے کیونکہ قیاس میں غلطیوں کا احتمال ہے

اس سلسلہ میں صرف ایک ہی چیز قابل لحاظ ہے جو سابقہ مثالوں سے بھی ظاہر ہے اور وہ راوی کی ثقاہت اور نفس روایت میں کذب و دروغ کا عدم احتمال ہے یعنی اگر راوی ثقہ ہے اور اس کی روایت ہر قسم کے شائبوں سے پاک ہے تو پھر خبر واحد کی حجیت میں کوئی کلام نہیں۔ چنانچہ علمائے اصول نے خبر واحد کے لئے کچھ شرطیں اور قیود بیان کی ہیں اور اصول کی کتابوں میں اس پر مفصل بحث موجود ہے:۔

العمل بخبر الواحد له شروط منها ماھو فی المخبر وھو الراوی و منھا ما ھو فی المخبر عنه وھو مدلول الخبر و منھا ما ھو فی الخبر نفسه (ارشاد الفحول ۴۸)	خبر واحد پر عمل کی چند شرطیں ہیں، بعض شرطیں راوی سے، بعض مدلول خبر اور بعض نفس خبر سے متعلق ہیں۔

اس کے بعد راوی کی شرطیں تکلیف (عقل و بلوغ) اسلام، عدالت، ضبط اور عدم تدلیس وغیرہ ہیں۔ مدلول خبر کی شرط یہ بتائی ہے کہ اس کا وجود عقلاً محال نہ ہو اور نہ وہ نص قطعی کے اس طرح خلاف ہو کہ دونوں میں جمع و تطبیق ناممکن ہو یا اجماع کے خلاف نہ ہو۔ پھر روایت اور خبر کی شرطوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

پس اگر صحت خبر کی جملہ شرطیں خبر واحد میں پائی جائیں تو اس کے استناد میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ تمام امت کا متفقہ فیصلہ ہے، آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام کا طرزِ عمل اس کے متعلق بیان کیا جا چکا ہے۔ ائمہ اور علمائے اعلام کا بھی یہی مسلک ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ حجیتِ خبرِ واحد کا معاملہ بالکل صاف اور واضح ہے البتہ چند چیزیں اور وضاحت طلب باقی رہ گئی ہیں۔

صحابہ کرام اور آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کو اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے اور اس سے یہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ خبر واحد کی (بشرطیکہ اسے ثقہ وضابط راوی بیان کرے) حجیت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں لیکن حضرت ابو بکرؓ وعمرؓ سے بعض ایسے واقعات مروی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک آدمی کی روایت کو قابلِ قبول نہیں سمجھتے تھے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ان بزرگوں کی طلبِ شہادت وتصدیق کا مطلب خبرِ واحد کی حجیت میں کلام وتردد نہیں ہے۔ کیونکہ اوّلاً تو خبرِ واحد اسی خبر کا نام نہیں ہے جو صرف ایک شخص سے مروی ہو بلکہ مشہور، عزیز اور غریب وغیرہ کا شمار بھی اسی میں ہوتا ہے۔ علمائے اصول نے حدیث کی مشہور اور عام دو ہی قسمیں بتائی ہیں ایک متواتر، دوسری آحاد۔ باقی مشہور، عزیز اور غریب وغیرہ آحاد کی قسمیں ہیں۔ زبیری نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے :۔

والآحاد باقامة الثلاثة مقبول يجب العمل به ومردود لم يترجح صدق المخبر (مٹ)	آحاد اپنی اقسام ثلاثہ کے ساتھ مقبول اور واجب العمل ہیں اور آحاد مردود وہ خبریں ہیں جس میں صدق کا پہلو راجح نہ ہو۔

ابن حنبل فرماتے ہیں :۔

وكلها سوى المتواتر آحاد (قفو الاثر م۶)	متواتر کے علاوہ (احادیث مقبول کی) تمام قسمیں آحاد ہی کہلاتی ہیں۔

ابراہیم شیرازی کا بیان نہایت واضح ہے :۔

لافرق ان يرويه واحد او اثنان (كتاب اللمع ص۴۱)	اس میں کوئی فرق نہیں کہ روایت ایک شخص بیان کرے یا دو اشخاص۔

صاحب ارشاد الفحول لکھتے ہیں :۔

والآحاد ینقسم الی اقسام فمنها خبر الواحد ... والثانی المستفیض والقسم الثالث المشهور.
(ص ۲۳۴)

آحاد کی کئی قسمیں ہیں جیسے خبرِ واحد ... دوسرے مستفیض اور تیسری قسم مشہور ہے۔

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں :-

کلها ای مشهور وعزیز وغریب آحاد وفیها المقبول والمردود والمتوقف۔

سب کی سب (یعنی مشہور عزیز اور غریب، آحاد ہی ہیں اور ان میں مقبول و مردود اور متوقف سبھی ہوتی ہیں۔

34730

بعض اور علمائے اصول نے بھی یہی لکھا ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خبرِ آحاد کا اطلاق ہر اس روایت پر ہوسکتا ہے جو متواتر نہ ہو، دو تین اور چار آدمیوں سے مروی روایت بھی اخبارِ آحاد میں شامل ہے، البتہ ان کی مزید اہمیت کی بناء پر اسے مشہور، مستفیض اور عزیز وغیرہ کا نام بھی دیا جاتا ہے اس لئے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے طلبِ شہادت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اخبارِ آحاد حجت نہیں ہیں غلط ہے ۔ کیونکہ دو آدمیوں کی تائید سے بھی جو روایت ثابت ہوگی وہ بھی خبرِ واحد ہی ہوتی ہے ۔ اس سلئے اصل اشتباہ صرف اس قدر ہے کہ کیا ایک آدمی کی روایت قابلِ حجت نہیں ؟

پہلے گزر چکا ہے کہ جمہور صحابہ اور خود آنحضور صلعم بھی ایک شخص کی روایت کو کافی خیال کرتے تھے اور ان دونوں بزرگوں کا طرزِ عمل بھی اسی قسم کا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود ان دونوں بزرگوں نے بھی اکثر مواقع پر صرف ایک شخص کی روایت قبول کرنے پر اکتفا کر لیا ہے پس جب ان دونوں بزرگوں سے بھی دونوں باتیں ثابت ہیں تو معلوم ہوا کہ دونوں ہی شکلیں ٹھیک ہیں۔ البتہ مزید تصدیق کا مقصد صرف اطمینان و انشراح اور حزم و احتیاط تھا۔ امام شافعی فرماتے ہیں -

" اس سے مقصود احتیاط تھی اگرچہ ایک شخص کی خبر کو بھی ثبوت و حجت کے لئے حضرت عمر رض کافی سمجھتے تھے البتہ دو راویوں سے اس لئے تصدیق طلب کی کہ مزید ثبوتِ صحت فراہم ہو جاتے ۔ اور یہ فطری طور پر ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اگر ایک شخص کے واسطے سے اسے کوئی روایت ملی ہے تو وہ شخصوں سے اس کی تصدیق کرتا ہے بلکہ ۵ طرق سے مروی روایت کے متعلق آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ ۶ طرق سے اس کی تصدیق و تائید ہو جائے کیونکہ جتنی ہی کثرت و تعددِ طرق سے روایت ثابت ہوگی اتنی ہی وہ

موکد اور ثابت ہوگی۔ اور آدمی کے دل کو اس پر اتنا ہی زیادہ اطمینان بھی ہوگا۔ حاکموں اور قاضیوں کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ دو عادل شاہدوں کے باوجود وہ مزید اطمینان خاطر کے لئے تین یا چار یا اس سے بھی زیادہ گواہوں کو طلب کرتے ہیں۔ لیکن اگر زیادہ گواہ نہیں ملتے جب بھی وہ دو گواہوں کی شہادت کے مطابق فیصلہ کر دیتے ہیں۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے جب ایک اور موید مانگا اور اس نے تائید کر دی تو فرمایا کہ

اما انی لم اتھمك ولكنی خشيت ان يتقول الناس علی رسول الله۔ میں آپ کو متہم نہیں خیال کرتا البتہ مجھے ڈر ہے کہ لوگ رسول اللہ پر جھوٹ نہ گڑھنے لگیں۔

یعنی انہیں ایک شخص کی روایت میں کوئی تردد نہیں تھا البتہ احتیاط اور آئندہ کے مضر اثرات کے خوف سے انہوں نے چاہا کہ کوئی اور تائید بھی اس کی حاصل کر لیں اس سے ثابت ہوگا کہ خبر واحد چاہے ایک راوی بیان کرے یا دو تین۔ وہ بہرحال حجت ہوگی اور اسی پر صحابہ کرام اور آنحضرت کا عمل بھی تھا خود یہ حضرات بھی مستقل دو اشخاص کی تائید ضروری نہیں سمجھتے تھے اور محض ایک شخص کی روایت پر بھی اعتماد کر لیتے تھے۔

کیا خبر واحد موجب علم و یقین بھی ہے؟

عام طور سے یہ سمجھا اور جمہور کا مسلک بھی اسی کو بتایا جاتا ہے کہ اخبار آحاد صرف موجب عمل ہیں، موجب علم و یقین نہیں۔ لیکن بعض روافض، معتزلہ اور قدریہ کے نزدیک وہ موجب عمل بھی نہیں۔ ایک اور جماعت کے نزدیک اخبار آحاد موجب عمل بھی ہیں اور موجب علم و یقین بھی۔ علامہ ابن حزم کی یہی رائے ہے اور انہوں نے علمائے اسلام میں حارث بن اسد محاسبی حسین بن علی کرابلیسی اور ابوسلیمان کا یہی مسلک بتایا ہے۔ ابن خویز منداد نے امام مالک سے بھی اس کی روایت کی ہے۔ امام شوکانی اور علامہ آمدی نے امام احمد کا بھی یہی قول بتایا ہے۔ بعض اہلحدیث کے نزدیک بعض روایتیں موجب علم ہیں مثلاً موطا کی وہ روایات جو سلسلۃ الذہب (مالک عن نافع عن ابن عمر عن رسول اللہ) کہلاتی ہیں۔ صاحب المصادر نے ابوبکر قفال سے حکایت کی ہے کہ خبر واحد علم ظاہر کا فائدہ دیتی ہے۔ صاحب قفواالاثر نے علامہ ابن حجر کی رائے تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

وقد يقع فی اخبار الآحاد ما يفيد العلم مختار مسلک یہ ہے کہ بعض اخبار آحاد علم نظری کا

النظر علی المختار وعنی به ما احتف بالقرائن وجعله انواعاً منها ما اخرجه الشیخان فی صحیحهما من اخبار الآحاد مما لم ینتقده احد من الحفاظ ولا وقع التجاذب بین مدلولیه حتی حصل الاجماع علی تسلیم صحته۔

فائدہ دیتی ہیں جبکہ قرائن سے ایسا معلوم ہو۔ حافظ نے اس کی کئی قسمیں بتائی ہیں ایک قسم ان اخبار آحاد کی ہے جن کی تخریج شیخین نے اپنی صحیح میں کی ہے۔ اور جن پر کوئی نقد نہیں کیا گیا ہے اور نہ ان کے مدلول میں کوئی قابل اعتراض بات ہے یہاں تک کہ اسکی صحت کی تسلیم پر اجماع ہو گیا ہے۔

علامہ آمدی نے اس کے متعلق اقوال نقل کرنے کے بعد تحریر کیا ہے:۔

والمختار حصول العلم بخبرہ اذا احتفت به القرائن

صحیح مسلک یہ ہے کہ خبر واحد موجب علم ہے بشرطیکہ قرائن موجود ہوں۔

علامہ شوکانی بھی اسی رائے کے ایک حد تک موید معلوم ہوتے ہیں۔

اس طرح کے بعض اور اقوال بھی سلف سے منقول ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جمہور کے مقابلہ میں ایک گروہ کے نزدیک خبر واحد سے یقین اور علم بھی حاصل ہوتا ہے۔

جو لوگ اخبار آحاد کے موجب علم وعمل ہونے کی نفی کرتے ہیں ان کا قول اپنے شذوذ کی بناء پر قابل اعتناء نہیں، البتہ اور دو اقوال لائق بحث ونظر اور قابل محاکمہ ہیں لیکن ان میں محاکمہ سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے، کہ حدیث کی حجیت اور وجوب عمل کی حد تک دونوں رایوں کا قدر مشترک اور ماحصل ایک ہی ہے، یعنی ان میں سے جو قول بھی چاہے اختیار کیا جائے۔ حدیث اور خبر واحد کی حجیت واستناد اور اس کے واجب العمل لائق قبول ہونے پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ روایت کی موجودگی میں چاہے وہ از قسم خبر واحد ہی کیوں نہ ہو کسی کے لئے کوئی اور مسلک اختیار کرنا جائز نہیں، علامہ ابن قیم فرماتے ہیں۔

فالواجب اتباع سنن رسول اللہ وتحکیمها والتحاکم الیها حتی یقوم الدلیل القاطع علی نسخ المنسوخ منها او تجمع الامة علی

سنت رسول کا اتباع اور اس کے مطابق فیصلہ کرنا لازمی ہے الا آنکہ کوئی قطعی دلیل اس کو منسوخ کر دے یا اجماع امت اس کے برخلاف

العمل بخلاف شئ منها وهذا الثاني محال... وأما ان تترك السنن لقول احد من الناس فلا كائنا من كان۔

ہو سکن یہ محال ہے ... لیکن سنتوں کو کسی شخص کے قول کی وجہ سے ترک نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ کتنا ہی مقدس شخص کیوں نہ ہو۔

دوسری جگہ اور وضاحت سے تحریر فرماتے ہیں:۔

والذی ندین الله به ولا یسعنا غیره وهو القصد فی هذا الباب ان الحدیث اذا صح عن رسول الله ولم یصح عنه حدیث آخر ینسخه ان الفرض علینا وعلی الامة الاخذ بحدیثه وترك كل ما خالفه و لا نترکه لخلاف احد من الناس كائنا من كان...

ہمارا شیوہ اور مذہب یہ ہے اور اس کے علاوہ کسی اور راہ کی گنجائش بھی نہیں اور یہی اس باب کا مقصود ہے کہ کوئی حدیث اگر رسول اللہ سے صحیح اور ثابت ہے اور اس کو کوئی اور صحیح و ثابت حدیث منسوخ نہ قرار دے رہی ہو تو ہم پر بلکہ پوری امت پر اس کو قبول و اختیار کرنا اور اس کے مقابلہ میں ہر چیز کو ترک کرنا فرض ہے اور ہم حدیث کو کسی شخص کے مخالف قول کی وجہ سے ہرگز ترک نہیں کر سکتے خواہ کوئی بھی ہو۔

محمد بن اسحاق بن خزیمہ کا بیان ہے۔

لا قول لاحد مع رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا صح الخبر عنه۔

رسول اللہ کے قول کے سامنے کسی کے قول کا اعتبار نہیں بشرطیکہ آپ سے وہ ثابت ہو۔

زفر بن ہذیل کہتے ہیں:۔

انما ناخذ بالرای ما لم نجد الاثر فاذا جاء الاثر ترکنا الرای واخذنا بالاثر۔

ہم رائے کو اسی وقت اختیار کرتے ہیں جب ہمیں اثر نہیں ملتا لیکن جب اثر مل جاتا ہے تو رائے کو چھوڑ کر اسے اختیار کر لیتے ہیں۔

امام شافعیؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

اذا حدث الثقة عن الثقة الی ان ینتهی الی رسول الله فهو ثابت ولا یترك لرسول حدیث ابدا الا

جب کوئی معتبر شخص دوسرے معتبر شخص سے حدیث بیان کرے اور یہ سلسلہ رسول اللہ تک پہنچ جائے تو وہ حدیث ثابت کہلائے گی اور رسول اللہ کی

حدیث وجد عن رسول اللہ اخبر بخالفہ۔	کوئی حدیث کسی حال میں بھی چھوڑی نہیں جا سکتی بجز اس صورت کے کہ خود رسول ہی سے کوئی اور اس کے مخالف روایت مل جائے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز سے مروی ہے :۔

لا رای لاحد مع سنۃ سنہا رسول اللہ	رسول اللہ کی سنت کے ہوتے ہوئے کسی کی رائے کا کوئی اعتبار نہیں۔

اسی طریقہ سے حضرت عمر، ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ بن عباس اور دیگر صحابہ نے بیشمار مسائل میں حدیث کو پاجانے کی صورت میں اپنے اجتہادات اور آراء ترک کر دیئے ہیں۔

اس وضاحت سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ یہ دونوں اقوال حدیث کی حجیت و استناد اور قابل عمل ہونے کی حد تک بالکل یکساں ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ ان میں اصح اور مرجح کون سا ہے، تو راقم کے خیال میں علامہ ابن حزم کی رائے ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں یہ بات کہ وہ موجب عمل ہیں لیکن موجب یقین نہیں کسی طرح عقل و ذہن کو اپیل نہیں کرتی۔ لیکن ابھی اس کے ایسے اطمینان بخش ثبوت نہیں مل سکے جو اہل علم کے سامنے پیش کئے جائیں۔

تقریظ و تنقید

اسلام اور مارکسزم

تالیف : محمد فضل الرحمان انصاری
قیمت :- ۵۰ پیسے
ناشر :- المرکز الاسلامی ۴ ماسٹر ہاؤس سمرسٹ سٹریٹ کراچی ۳
صفحات :- ۲۰

عہد جدید میں مارکس نے ارتقائے تاریخ انسانی کی جو مادی تعبیر پیش کی ہے اور اس کے نتائج پر معاشی و معاشرتی اور سیاسی نظام کی جو فکری عمارت کھڑی کی ہے اس سے نہ صرف اہلِ مغرب کے مروجہ افکار و نظریات ڈھے جاتے ہیں بلکہ مذہبی مسلمات کی بھی مکمل مخالفت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ مختلف اصحابِ دین و دانش نے مارکس کے فکر و فلسفہ کو تنقید کا موضوع بنایا ہے۔

پیش نظر رسالہ میں جناب محمد فضل الرحمٰن انصاری ۔۔۔۔ صدر عالمی جمعیت تبلیغ اسلام نے مارکسی نظریہ حیات اور اسلامی نظام حیات کے اساسی فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک مارکسزم عقیدۂ وجود باری تعالیٰ کی نفی کرتا ہے۔ اس کی بنیاد میکانکی فلسفہ اور مادی نفسیات پر قائم کی گئی ہے۔ اس فلسفہ میں صحیح قدر صرف معاشی قدر ہے جبکہ اس کے برعکس اسلام کا فلسفۂ حیات از اول تا آخر روحانی قدر پر مبنی ہے۔ جس میں ہر سچے مسلمان کی زندگی کا ہر شعبہ خواہ اس کا تعلق مادی اقدار سے ہو یا روحانی اقدار سے، رضائے الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ و نمونہ ہونا چاہیئے۔

مارکسی فلسفہ طبقاتی کشمکش کی آگ سے زندگی حاصل کرتا ہے جبکہ اسلام نے انسانی اخوت کے نظریہ کی آبیاری کر کے مادی مفادات کے حصول کے لئے طبقاتی کشمکش کی اس آگ کو ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کر دیا ہے۔ اسی طرح مارکسی نظام فکر میں فرد کی آزادانہ حیثیت ختم ہو کر رہ گئی ہے اور وہ سماج کا ایک بے جان کل پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے فرد اور جماعت کے باہمی تعلقات کا ایسا حسین امتزاج پیش کیا ہے جس سے دونوں کے مفاد میں کامل ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔

لیکن جناب انصاری صاحب نے اسلام کی اقتصادی تعلیمات کا جو مختصر نقشہ پیش کیا

ہم موصوف اس کی تصدیق کرنے سے قاصر ہیں۔ بالخصوص صنعت و حرفت کے میدان میں ان کا یہ ارشاد محل نظر ہے کہ اسلامی نظام میں فولاد کی صنعت اور تیل کی صنعت کے قارونوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر اس سے ان کی مراد بنیادی صنعتوں کی اجارہ داریوں کا خاتمہ ہے تو اس کے لیے انہوں نے موزوں الفاظ استعمال نہیں کیے لیکن بظاہر نظر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے سے ان ذرائع پر شخصی ملکیت کو ہی ختم کرنے کے حق میں ہیں۔ ہمیں اس بات سے انکار نہیں کہ مخصوص حالات میں حکومت کو پیداواری ذرائع اپنی تحویل میں لینے کا حق حاصل ہے بشرطیکہ اس سے مفادِ عامہ کو فروغ حاصل ہونے کی قوی توقع ہو لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اسلام کا عمومی مزاج ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت و تصرّف کو برقرار رکھتا ہے۔

ہمیں انصاری صاحب کے اس خیال سے بھی پوری طرح اتفاق نہیں کہ زراعت کے میدان میں اسلام جاگیرداری کا مخالف ہے اور اس کا نصب العین حق ملکیت رکھنے والے کاشتکاروں کا معاشرہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو جاگیریں حکمرانوں کی غلط بخشیوں کا نتیجہ ہوں یا جو ملی مفاد کے خلاف سرگرمیوں کا صلہ ہوں ان کے بقا کی اسلامی نظام میں کوئی گنجائش نہیں لیکن مفادِ مسلمین کے لیے اگر بعض حالات میں ایسی جاگیریں قائم کرنی ناگزیر ہوں تو یہ اسلامی تعلیمات کے منافی نہیں ہے۔ البتہ اس تصور کی تو اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں کہ اسلام کا نصب العین حق ملکیت رکھنے والے کاشتکاروں کا معاشرہ ہے کیونکہ ملکیتی کاشتکاری کے ساتھ ساتھ مزارعت عہدِ صحابہؓ اور اس کے بعد ہی نہیں خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں موجود رہی ہے اور اس کی جائز و ناجائز صورتوں کی خود شارع نے نشاندہی کر دی ہے۔

انصاری صاحب کے اس نقطۂ نظر سے ہمیں شدید اختلاف ہے کہ موجودہ نظریات میں اسلام کا اقتصادی نظام سوشلزم سے زیادہ قریب ہے۔ ہمارے نزدیک یہ رجحانِ فکر ذہنی مرعوبیت کا آئینہ دار ہے۔ اسلام بذاتِ خود ایک منفرد نظریہ و نظام حیات ہے جو اپنی اصل و فرع اور ظاہر و باطن کے اعتبار سے سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں سے مختلف اور ممتاز ہے۔ ہمیں ایسے پیمانوں سے اسلام اور دیگر نظریات کے قرب و بعد کی پیمائش سے احتراز کرنا چاہیے کیونکہ اس سے ذہنوں میں ژولیدہ فکری پیدا ہوتی ہے۔

(د۔ا۔ر)

کیا عورت سربراہ مملکت ہو سکتی ہے

مصنفہ :- مولانا حکیم محمود احمد ظفر

صفحات :- ۴۰ ، قیمت :- ۳۷ پیسے

ناشر :- مکتبہ تعمیر حیات ، اردو بازار ، لاہور

اس چھوٹے سے کتابچے کی تصنیف و تدوین میں حکیم صاحب محترم نے صرف قرآن و سنت کے تشفی بخش احکامات کی شرح پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ فقہا ءعظام اور علمائے ثقات کے مدلل حوالہ جات سے موضوع بحث میں مسکت رائے متعین کر دی ہے - علامہ ابن تیمیہؒ ، ابن رشد اندلسیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے اقوال اس سلسلے میں جو اہمیت رکھتے ہیں وہ کسی بھی اہل علم سے پوشیدہ نہیں -

حضرت عائشہؓ قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص کے سلسلے میں جنگ جمل کے موقعہ پر محض اصلاح بین المسلمین کے نقطۂ نظر سے گھر سے نکلی تھیں اس واقعہ کو عورت کی سربراہی جائز کرنے والے کم فہم اہل سیاست اپنے مقصد کیلئے غلط رنگ میں پیش کرتے رہے ہیں ظفر صاحب نے اس واقعہ کی صحیح پوزیشن واضح کی ہے اور اصلاح بین المسلمین کی غرض سے حضرت عائشہؓ کے نکلنے پر بھی صحابہ عظام اور امہات المومنین نے جو نکیر فرمائی وہ نقل کی ہیں -

امداد الفتاویٰ میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حدیث کے ایک اشکال کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا ظفر صاحب نے اس کی بالکل صحیح حقیقت واضح کر دی ہے اور اس جواب کو فتویٰ کی شکل دیکر اپنے مقصد میں غلط طور پر پیش کرنے والے اخبار بازوں کے استدلال کا بے تکا پن ظاہر کر دیا ہے اسی کے ساتھ ساتھ مفتی محمد شفیع صاحب کے حالیہ فتویٰ کو بھی ان کی اپنی سابقہ متعدد تحریروں سے بالکل متضاد اور مضحکہ خیز ثابت کر کے رکھدیا ہے -

پمفلٹ کے آخر میں مولانا فیض اللہ صاحب (مشرقی پاکستان) کا اسی سلسلہ کا ایک مفصل جواب منقول ہے اور ظفر صاحب نے مودودی صاحب کے ایک چیلنج کا ان کے اسی سلسلے کے سابقہ چیلنج اور دعاوی سے تقابل کر کے فیصلہ ہر صحیح فیصلہ کرنے والے پر چھوڑ دیا ہے - حکیم صاحب نے اس چھوٹے سے پمفلٹ کے لئے جو محنت اور مطالعہ کیا ہے اس کا اندازہ تو کچھ اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکے گا ◆

(ع - و)

محی الدین پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر ، دفتر "میثاق" رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲ سے شائع کیا

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۱۱ | شوال و ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ | شمارہ ۲ و ۳

فہرست مضامین

ترسیل زر اور خط کتابت کا پتہ

منیجر ماہنامہ میثاق، رحمانپورہ۔ اچھرہ، لاہور۔ ۱۲

ہندوستانی خریداروں کے لئے ترسیل زر کا پتہ:-

منیجر دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح

(سرائے میر۔ اعظم گڑھ۔ یوپی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ہمارے مخدوم جناب چوہدری نیاز علی خاں صاحب نے جوہر آباد سے اطلاع دی ہے کہ انہوں نے ادارہ دارالاسلام کے قیام کا اعلان کر دیا ہے ۔ یہ وہی ادارہ ہے جو چودھری صاحب موصوف نے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی تجویز کے مطابق پٹھان کوٹ (ضلع گرداسپور) میں قائم کیا تھا۔ یہ ادارہ تقسیم ملک کی نذر ہو گیا اور چوہدری صاحب نے جو کچھ وہاں بنایا تھا سب ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں چلا گیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اس عظیم حادثے کے بعد ہمت ہار بیٹھتا لیکن چودھری صاحب نے سب کچھ ہارنے کے بعد بھی ہمت نہیں ہاری ۔ پاکستان میں آکر انہوں نے جس طرح اپنی ذاتی املاک وجائداد کی بحالی کی کوشش کی اس سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ انہوں نے دارالاسلام کے از سر نو قیام و تعمیر کی جدوجہد کی اور باوجود ضعف و ناتوانی جوانوں سے بھی زیادہ عزم و ہمت سے کام لے کر پٹھان کوٹ کے کھوئے ہوئے دارالاسلام کو جوہر آباد میں اس سے زیادہ شان و اہتمام کے ساتھ از سر نو قائم کر دیا۔ پہلا دارالاسلام تو ان کے صرف دینی جذبہ اخلاص کی ایک یادگار تھا لیکن یہ دارالاسلام ان کے دینی جذبہ کے ساتھ ساتھ ان کے غیر متزلزل عزم، ان کی ناقابل شکست ہمت اور ان کی ان تھک محنت کی بھی ایک غیر فانی یادگار ہے ۔ اس عمر میں ان کی اس ہمت کو دیکھ کر فی الواقع رشک آتا ہے اور دل سے دعا نکلتی ہے کہ اگر ہماری قوم باہمت نوجوانوں سے خالی ہو رہی ہے تو اللہ تعالیٰ کچھ ایسے بوڑھے ہی قوم میں پیدا کر دے جن کی مثالوں سے ہم کچھ سبق حاصل کر سکیں۔

رمضان شریف سے چند دن پہلے ایک تقریب کی شرکت کے سلسلے میں جوہر آباد جانے اتفاق ہوا تو کھڑے کھڑے دارالاسلام کی عمارتیں دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ یہ دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی

چودھری صاحب نے وہ سارا رقبہ جو عمارات کے لئے خاص کیا تھا، موزوں، خوش وضع اور ضروری عمارتوں سے بھر دیا ہے۔ ایک خوبصورت مسجد تعمیر ہوئی ہے جس کے اندر چودھری صاحب نے وہ تمام پہلو ملحوظ رکھے ہیں جو ان کے دینی تصور کے مطابق اس عہد کی ایک مسجد میں ملحوظ ہونے چاہئیں۔ اس سے متصل ہی کتب خانے کے لئے ایک نہایت موزوں ہال ہے جو بیک وقت مطالعہ اور تقریر دونوں کی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ ایک بازو پر طلبہ کے قیام کے لئے کمرے ہیں جو روشن اور ہوادار ہیں اور ان میں طلبہ کی ضرورت کے بقدر ضروری فرنیچر بھی فراہم کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ طلبہ کی تربیت کرنے والوں کے لئے دو تین نہایت موزوں کوارٹر ہیں اور ایک کشادہ ڈائننگ ہال بھی ہے۔ اس کی ہر عمارت پر جہاں سابق دارالاسلام کی چھاپ نظر آتی ہے، جس سے اُس کے ماضی کی یاد تازہ ہوتی ہے، وہیں اس میں بعض ایسے اضافے بھی ہیں جن سے اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے کہ نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل۔ جگہ نہایت کھلی ہوئی ہے۔ سابق دارالاسلام کی طرح یہ بھی اپنے ہی ماحول سے آباد ہوگا۔ شرکتِ غیر کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو ایک تربیت گاہ کے لئے اس زمانے میں نہایت ضروری ہے۔

اس ادارے کے پیشِ نظر فی الحال یہ ہے کہ مقامی کالج اور مقامی اسکولوں میں جو طلبہ زیرِ تعلیم ہیں وہ قیام اس ادارے کے ہاسٹل میں کریں تاکہ اسکول اور کالج سے فارغ اوقات ان کے ایک دینی اور اسلامی ماحول میں گزریں۔ اس ادارے میں ان طلبہ کے لئے دینی تعلیم و تربیت، نماز باجماعت، مطالعہ، کھیل، رہائش اور کھانا، ہر چیز کا اہتمام ہوگا اور ادارے میں مقیم طلبہ کے لئے ضروری ہوگا کہ اس کے قواعد و ضوابط کی پابندی کریں اور اپنی ساری دلچسپیاں اس کے حدود تک محدود رکھیں۔ ان تمام سہولتوں کے مقابل میں ماہانہ خرچ کے طور پر طلبہ کو صرف ۴۵ روپے ادا کرنے پڑیں گے۔ موجودہ زمانے میں اتنے قلیل معاوضے میں یہ ساری سہولتیں نہایت ارزاں ہیں اور ادارے کے فوائد کو سامنے رکھتے ہوئے تو ان کو مفت کہنا بھی بیجا نہیں۔ اچھا ماحول تو اس زمانے میں ایسی نایاب شے ہے کہ بڑی سے بڑی قیمت دے کر بھی اس کا حاصل کرنا ممکن نہیں۔ جوہرآباد کے مسلمان خوش قسمت ہیں کہ اُن کے بچوں کے لئے ایک دینی دردمند نے یہ ماحول مہیا کر دیا۔ ہمیں اُمید ہے کہ وہاں کے مسلمان اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

آج ہر شخص کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ موجودہ تعلیم دنیا کے اعتبار سے جو قدر و قیمت بھی رکھتی ہو لیکن دینی اور ملی نقطۂ نظر سے وہ ایک قاتل زہر ہے۔ اس زہر کے لئے اصل تریاق فراہم کرنا تو ملک کے تعلیمی کار فرماؤں کا کام ہے، وہ ہمہ شما کے بس کا کام نہیں ہے، لیکن اس زہر کی ایک حد تک تلافی اس طرح کے اداروں سے بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ طلبہ اور ان کے سرپرست ان کی افادیت سمجھیں اور اُن کی قدر کریں۔

اس طرح کے اداروں کی ضرورت پر ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بھی جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، زور دیا ہے اور اس دور میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی بھی برابر اس کی طرف توجہ دلاتے رہے ہیں۔ شکر ہے کہ چودھری صاحب کی کوشش سے ان بزرگوں کی خواہش کے مطابق ایک ادارہ تو قائم ہوا۔ خدا کرے دوسرے مقامات پر بھی اس نمونے کی تقلید کرنے والے پیدا ہوں۔ خاص طور پر بڑے شہروں میں اس کی شدید ضرورت ہے۔ ہم نے حلقۂ تدبرِ قرآن کی اسکیم جو شروع کی ہے وہ ذرا اس سے مختلف ہے، اس کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں اور اس سے پیشِ نظر بھی ایک بلند مقصد ہے لیکن اصلاً ہے وہ بھی اسی لئے کہ جدید تعلیم کے فتنوں کا توڑ اُسی تعلیم کے فارغوں کے ذریعے سے کیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس طرح کے حلقے جگہ جگہ قائم ہو رہے ہیں۔ اور مزید چار شہروں سے ان حلقوں کے افتتاح کے لئے دعوت نامے موصول ہوئے ہیں۔ اندازہ ہوا کہ لوگوں میں اس کی طلب بہت ہے، بس مشکل جو ہے وہ یہ ہے کہ اس کام کے لئے جن صلاحیتوں کے اشخاص کی ضرورت ہے وہ نہیں مل رہے ہیں لیکن مایوس نہیں ہونا چاہیئے، کام شروع ہو گیا ہے تو اشخاص بھی پیدا ہونے لگیں گے۔

چودھری صاحب محترم کی خواہش ہے کہ علما اور دوسرے اصحابِ علم جو اس مقصد کو عزیز رکھتے ہیں وقتاً فوقتاً اس ادارے کے طلبہ اور منتظمین کو اپنے فیوض سے مستفید فرمائیں تاکہ لوگوں پر اس کی اہمیت افادیت واضح ہو۔ ہمارے نزدیک چودھری صاحب کی یہ خواہش بالکل بجا ہے۔ اس طرح کے اد[ارو]ں کے اندر زندگی اور حرارت قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کو صرف ان کے منتظمین ہی پر نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ وہ اہلِ علم جو اس مقصد کو عزیز رکھتے ہیں مناسب اوقات میں ان میں پہنچ کر اپنے مشورہ

اپنی علمی اور مذہبی تقریروں سے اس کو زیادہ سے زیادہ موثر اور مفید بنانے کی کوشش کریں۔ یہ انفرادی کام نہیں ہیں بلکہ ملی و اجتماعی خدمت ہے اور اس نقطۂ نظر سے آج ہر صاحب احساس کو اس طرح کے کاموں سے دلچسپی لینی چاہیئے۔ یہ کم سے کم کوشش ہے جو آج نئی نسل کے دین کو موجودہ تعلیم کے بُرے اثرات سے بچانے کے لئے اختیار کی جا سکتی ہے۔ ہم نے چودھری صاحب سے یہ وعدہ کیا ہے کہ سال میں ایک دو بار اس ادارے کے لئے ہم ہفتہ دو ہفتہ اپنے اوقات میں سے ضرور نکالیں گے۔

(۲)

اس دوران میں ہمیں ملک کے دونوں بازوؤں سے دینی احساس رکھنے والے مسلمانوں کے بکثرت خطوط اس مضمون کے موصول ہوئے ہیں کہ اس وقت ملک میں کوئی جماعت ایسی موجود نہیں ہے جو ملک میں پیدا ہونے والے مسائل پر صحیح دینی نقطہ نظر سے نگاہ ڈال سکے اور پھر موثر طور پر اس نقطہ نظر کو ملک کے عوام و خواص سب کے سامنے پیش کر سکے۔ اس سلسلے میں اگر کچھ کام ہو رہے ہیں تو ان دوستوں کا خیال یہ ہے کہ ان کی نوعیت انفرادی کاموں کی ہے، یہ کام بجائے خود کتنے ہی قیمتی اور باوقعت ہوں لیکن یہ وہ اثر نہیں پیدا کر سکتے جو اجتماعی نوعیت کے کسی کام کی ہو سکتی ہے۔ ان دوستوں کا یہ خیال بھی ہے کہ یہ خلا جو پیدا ہوا ہے اگر یونہی باقی رہا، اس کو جلد سے جلد کسی صحیح قسم کی تنظیم سے بھرنے کی کوشش نہ کی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کے ہر شعبہ زندگی میں جو فتنے اٹھ رہے ہیں وہ پوری آزادی سے راہ پالیں گے اور جب وہ ایک مرتبہ اذہان و قلوب اور تہذیب و معاشرت پر چھا جائیں گے تو پھر موجودہ سازگار ماحول میں وہ اتنی گہری جڑیں جما لیں گے کہ ان کا اکھاڑنا تو درکنار ان کو ہلانا بھی شاید دشوار ہو جائے۔

ہمارے نزدیک جن دوستوں نے یہ خیالات ظاہر کئے ہیں ان کا اندازہ اور تجزیہ بالکل صحیح ہے اس پر اتنا اضافہ ہم اور کرنا چاہتے ہیں کہ اس دوران میں سب سے زیادہ جس گروہ کے وقار کو نقصان پہنچا ہے وہ مذہبی گروہ ہے۔ ایک نہایت سخت امتحان کے موقع پر بہت تھوڑے لوگوں نے یہ توفیق پائی کہ وہ بے لوث ہو کر دین کی ترجمانی کا صحیح حق ادا کر سکے۔ خاص طور پر معاملے کا یہ پہلو سب سے زیادہ افسوسناک ہے کہ جن لوگوں سے دین کی صحیح ترجمانی کی سب سے زیادہ توقع تھی وہ یا تو حالات

کے بہاؤ میں غلط سمت میں بہہ گئے یا نہایت غلط قسم کی مصلحت اندیشیوں کے چکر میں پھنس کر تذبذب کا شکار ہو گئے۔ گروہوں اور جماعتوں کی صلاحیتوں کا امتحان روز روز نہیں ہوتا، خاص خاص مواقع ہی پر ہوتا ہے، لیکن جب ہوتا ہے تو اس میں کامیابی اور ناکامی کے نتائج نہایت دُور رس ہوتے ہیں۔ انہی مواقع پر مخالف اور موافق دونوں یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ کن کی قوتِ فیصلہ قابلِ اعتماد ہے اکن کی نہیں اور کن کے کردار پر اعتماد کیا جانا چاہیئے کن کے کردار پر نہیں۔ مجرد سیاست کا میدان ہو تو اس میں گرنا اور اُٹھنا دونوں معمولی بات ہوتی ہے ہوسکتا ہے کہ ابھی آپ گرے، ابھی گرد جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے کسی نے تالی پیٹی اور قہقہہ لگایا، کسی نے ہمدردی کی اور ذرا چوٹ سہلا دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاست میں سب کچھ کھیل سمجھا جاتا ہے۔ اس میں صبح کو آپ کسی اور سوٹ میں نمایاں ہو سکتے ہیں، شام کو کسی اور جامے میں لیکن مذہب میں کوئی چیز بھی کھیل کی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہاں ہر چیز نماز کی طرح عبادت اور ہر میدان مسجد کی طرح محترم ہے۔ اس کوچے میں بھرم بھی بڑی مشکل سے قائم ہوتا ہے۔ برسوں کی ریاضت نفس کشی اور بے لوثی کی زندگی کے بعد کہیں جا کر کوئی شخص یا گروہ لوگوں کی نگاہوں میں اعتماد و حسن ظن کی جگہ پاتا ہے۔ اور یہ جگہ پانے کے بعد ایک ذرا سی غلطی سے بڑی آسانی کے ساتھ اُس کو کھو بھی دیتا ہے کردار کی معمولی سی کمزوری اور ارادے کی معمولی سی لغزش برسوں کے کئے کرائے پر اس طرح پانی پھیر دیتی ہے کہ سب نقش بر آب ہو کر رہ جاتا ہے۔ مذہب کے دیار کی روایات یہی ہیں۔ یہاں چڑھنے میں بڑی دیر لگتی ہے اور گرنے کے بعد سنبھلنا کم ہی کسی کو نصیب ہوا ہے۔

ان حالات میں اس ضرورت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ یہاں ایک ایسی جماعت کی شدید ضرورت ہے جو ملک میں پیدا ہونے والے تمام مسائل پر کتاب و سنت کی روشنی میں غور کرے اور بالکل بے لوث ہو کر حالات کا احتساب کرے۔ اس جماعت کا کام دعوتی، تنقیدی اور تعلیمی تینوں نوعیتوں کا ہونا چاہیئے۔ یہ ملک کے جمہور کو بلا امتیاز اعلیٰ و ادنیٰ اسلامی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دے۔ یہاں جو غلط رجحانات سر اٹھائیں خواہ جمہور کی طرف سے یا ارباب اقتدار کی طرف سے، ان پر آزادی کے ساتھ تمام موثر طریقوں سے تنقید کرے، اور اس دور میں دین اور دینی تعلیم کے تحفظ کے لئے تدبیریں اختیار کرنی ممکن ہوں، وُہ اختیار کرے۔ آج چھوٹے چھوٹے کام جو الگ الگ ہو رہے ہیں

اگر ایک نظم کے تحت ہونے لگیں اور ان کو جماعتی نظم کی رہنمائی اور اس کی تائید حاصل ہو جائے تو اولاً تو انہی کی تاثیر اور افادیت وسعت کئی گنی بڑھ جائے گی۔ ثانیاً خدمت دین و ملت کی دوسری بہت سی راہیں کھل جائیں گی جن کا انفرادی کوششوں سے کھلنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

اس تنظیم کی استقامت اور صحیح فیض رسانی کا انحصار اس امر پر ہے کہ یہ اقتدار کی ہوس اور سیاسی طالع آزمائی کے فتنہ سے اپنے آپ کو ہر پہلو سے محفوظ رکھے۔ اقتدار کی ہوس بس کی گانٹھ ہے۔ جس کے اندر اقتدار کی ہوس ہو اس کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کی دینی آنکھ کھلی رہ سکے۔ جو شخص اقتدار کی ہوس سے آزاد ہو وہ اگر اقتدار کی آزمائش میں ڈالا جائے تو اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ جادہ مستقیم پر استوار رہے۔ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ لیکن اقتدار کے بھوکے افراد اور جماعتوں نے فساد فی الارض کے سوا آج تک کچھ نہیں کیا۔ اصل کام خیر خواہی اور بے لوثی کے ساتھ لوگوں کے سامنے اللہ کا دین پیش کرنا ہے۔ اگر کسی معاشرہ میں اللہ کا دین جڑ پکڑے گا تو اس معاشرہ کی سربراہی خود بخود دین اور اہل دین کے ہاتھوں میں آجائے گی اور اگر دین نہیں جڑ پکڑے گا تو خواہ کچھ ہی کیجئے لیکن اس بُرے درخت سے بُرے ہی پھل پیدا ہوں گے۔ بُرے معاشرے میں اگر کوئی اچھا آدمی اقتدار کسی طرح حاصل کر بھی لے تو اسے یا تو خود بُرا بننا پڑتا ہے یا پھر اس کو اپنی جگہ طوعاً و کرہاً معاشرے کے مزاج کے موافق آدمی کے لئے خالی کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ اس زمانے میں تو یہ بھی تجربہ ہوا ہے کہ اچھے آدمی اگر کسی راہ سے اقتدار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو وہ بروں سے بھی زیادہ بُرے بننے پر مجبور ہوئے ہیں۔ پھر جب فی الواقع اچھے آدمی ماحول کے بُرے اثرات سے متغیر ہو سکتے ہیں تو ان لوگوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے جن کا ادعائے حسن محض نمائشی غازہ ہے جو آزمائش کی ایک معمولی رگڑ کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یوں کہئے کہ جن کی خود سپردگی اور افتادگی کا عالم ہے کہ مانگنے سے پہلے سب کچھ خود ہی دے بیٹھتے ہیں۔

بہرحال ہم اس طرح کی کسی تنظیم کی ضرورت کو وقت کی ایک فطری ضرورت سمجھتے ہیں۔ اگر اللہ کے بندوں نے اس کے لئے قدم اُٹھایا تو ہم اُن کا خیر مقدم کریں گے، ان سے تعاون کریں گے

اور اپنے پاس علم و عمل کی جو قوتیں اور صلاحیتیں ہیں، ان سے ان کے ساتھ شرکت عمل کریں گے۔ لیکن یہ امر بھی ہم بے تکلف ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ اس وقت ہمارے پیش نظر علم دین کی خدمت کے جو کام ہیں وہ ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم شرکت و تعاون سے آگے بڑھ کر اس طرح کی تنظیم کی ذمہ داری براہ راست اٹھائیں۔ ہم نے اپنے ذمے جو کام لے رکھے ہیں، ہماری طاقت نچوڑ لینے کے لئے وہی کافی ہیں۔ یہ کام کم از کم اپنی نگاہوں میں، ایسے نہیں ہیں جن کو ہم نظر انداز کر سکیں۔ ہم تفسیر تدبر قرآن کی تکمیل اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے ذی صلاحیت نوجوانوں کو علم دین سے آراستہ کرنے کی جدوجہد کو اس وقت نہایت ضروری کام سمجھتے ہیں۔ ہمارا گمان یہ ہے کہ ان کاموں کے لئے تھوڑی بہت صلاحیت اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ جو آدمی اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کرتا ہے نیت نیک ہو تو اللہ تعالیٰ اس میں برکت دیتا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ہر آدمی انبیاء کے طریقے پر پورے دین کو لے کر نہیں اُٹھ سکتا۔ بلکہ سچ پوچھیے تو ہم تو اس کو ایک خبط سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو ہم شما کے لئے اتنا ہی بس ہے کہ اپنی صلاحیت کے مطابق دین و ملت کی کوئی چھوٹی موٹی خدمت کر جائیں۔ اگر اخلاص کے ساتھ بُنیانِ ملت کی ایک اکھڑی ہوئی اینٹ بھی اپنے ہاتھوں اس کی جگہ پر جم گئی تو شاید نجات کے لئے وہی کافی ہو جائے۔ اس کو حوصلہ کی تنگی سمجھئے یا تجربہ کی تلخی، سب کچھ پانے کے ادعا کے زعم میں سب کچھ کھو دینے کے بجائے سلامتی اسی میں نظر آئی ہے کہ ملت اسلامیہ کی خدمت کے بے شمار گوشوں میں سے جس خدمت کی صلاحیت اپنے اندر محسوس ہوئی ہے اس کو لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دُعا یہ ہے کہ استقلال اور اخلاص نصیب ہو۔ تاہم جیسا کہ ہم نے عرض کیا ان کاموں کے ساتھ ساتھ ہر اس اجتماعی کام میں تعاون کے لئے ہم تیار ہیں جو اسلام کی خدمت کے لئے ہو۔ میثاق پر جو وقت اور طاقت ہم صرف کرتے ہیں اس سے ایک مقصد یہ بھی پیش نظر ہے کہ معاشرہ کی خدمت کا جو فرض ہم پر عاید ہوتا ہے وہ ایک حد تک ادا ہوتا رہے۔

(۳)

قتل ناحق خواہ کسی محرک کے تحت بھی ظہور میں آئے، خدا اور انسان دونوں کے قانون میں سب سے بڑا جرم ہے لیکن اگر اس کا محرک سیاسی ہو تو پھر تو اس کی سنگینی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بسا اوقات اس کے نتیجے میں نہ صرف پوری قوم کی قوم خطرے میں پڑ جاتی ہے بلکہ یہ کہنا بھی

مبالغہ نہیں ہے کہ پورے عالمِ انسانی کے لئے اس سے تباہی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ آخر پہلی جنگ عظیم کا آغاز ایک سیاسی قتل ہی سے ہوا تھا جس کے نتیجے میں ساری دنیا آگ اور خون میں ڈوب گئی!

سیاسی قتل کے وجوہ و اسباب کیا ہوتے ہیں؟ یہ مسئلہ بڑا تفصیل طلب ہے۔ اس پر اگرچہ بہت سی باتیں ہمارے سامنے ہیں اور شاید کبھی ان کے کہنے کی نوبت آئے بھی لیکن اس وقت ہم سوال کے علمی و نفسیاتی تجزیہ کے بجائے اپنے ملک کی حکومت کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے ہاں اس رجحان کے ختم کرنے کے لئے اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا دے۔ یہ فتنہ ایک ایسا فتنہ ہے جس میں بڑھنے کی بڑی غیر معمولی صلاحیت ہے اور اس سے ہمارے ملک کا امن و عدل ہی نہیں بلکہ بالآخر اس کی آزادی تک خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ہمارے مشرقی ممالک کا مزاج جن بیماریوں کے قبول کر لینے کے لئے سب سے زیادہ مستعد ہے ان میں سے یہ بیماری شاید سرِفہرست ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ احتیاط برتی جائے۔

سرِ چشمہ شاید گرفتن بہ بیل
چو پر شد نہ شاید گزشتن بہ پیل

ہمارے ملک میں سیاسی قتل کے محرکات ابھی زیادہ گہرے نہیں ہیں لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے ذہنوں میں یہ رجحان نشو و نما پا رہا ہے کہ پستول کی گولی بھی سیاسی مسائل کا کوئی حل ہے۔ یہ رجحان بڑی مستعدی سے ختم کرنے کی ضرورت ہے اور اس کو ختم کرنے کے لئے حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف دونوں کا پورا پورا تعاون ضروری ہے۔ اس نقطے پر دونوں صدقِ دل کے ساتھ اتفاق کریں کہ سیاسی قتل دنیا میں کبھی بھی کسی قوم کے مسائل کے حل کا ذریعہ نہیں بن سکا ہے۔ اس سے صرف انتشار، بدامنی اور آمریت یا غلامی کے راستے کھلے ہیں۔ ہمیں کسی صورت میں بھی اپنی قوم کو اس راستے پر نہیں جانے دینا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اگر قوم کے لیڈروں کے اندر یہ عقیدہ پختہ ہو جائے گا تو یہ فتنہ زیادہ بڑھنے نہیں پائے گا۔

دوسری چیز اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ انتخابی سرگرمیوں کو یا تو، جیسا کہ میثاق کے پچھلے پرچے میں ہم نے عرض کیا ہے، شرعی حدود و قیود اور اسلامی ضابطۂ اخلاق کا پابند کیا جائے یا کم سے کم اس

امر کو لازم قرار دیا جائے کہ پارٹیاں اپنی پالیسی، پروگرام اور منشور کے سوا کسی دوسری ایسی چیز کو زیر بحث نہ لائیں جو اشتعال اور ہیجان انگیزی کا باعث بنے۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ الیکشن کے شیطانی کھیل میں ان چیزوں کا سدباب ممکن نہیں ہے لیکن جب تک لوگوں کے اندر کھلاڑیوں کا ذہن نہیں پیدا ہوتا اُس وقت تک ان چیزوں پر قدغن ضروری ہے جو قتل و خون تک نوبت پہنچا دینے والی ہیں۔ اس مسئلے پر صدر ایوب کو بھی غور کرنا چاہیئے اور مختلف پارٹیوں کے لیڈر حضرات کو بھی۔

ایک چیز یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک میں گُنڈوں کو بالتدریج شہ حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ یہی عنصر ہے جو سیاسی قتل کے خوفناک اقدامات کے لئے کرایہ پر حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر اس عنصر کو ختم کر دیا جائے یا دبا دیا جائے تو ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اس فتنہ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہ کام بہرحال حکومت کے کرنے کا ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں ذرا باک نہیں ہے کہ گُنڈوں کی یہ آزادی جو اس وقت نظر آ رہی ہے، یا تو حکومت کی کمزوری کی دلیل ہے یا اس کی سہل انگاری کی اور ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو حکومت کے شایانِ شان ہو۔ ملک کے امن پسند شہری ہر قیمت پر اپنے تحفظ کے حق دار ہیں اور یہ چیز ان کے لئے مہیا کرنا حکومت کی اولین ذمہ داری ہے۔

(۴)

ہمارے ملک میں طلبہ کا مسئلہ بھی ایک نازک مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ طلبہ اپنے سارے مسائل خود ہی حل کرنا چاہتے ہیں اور اس کا ذریعہ انہوں نے مظاہرے، اسٹرائیکیں اور بھوک ہڑتالیں سمجھ رکھا ہے جس کے سبب سے نہ صرف تعلیم کا غیر معمولی نقصان ہو رہا ہے بلکہ آئے دن ایسے ناخوشگوار حالات پیش آ رہے ہیں جن کا مزید جاری رہنا ان طلبہ کی بھی بدقسمتی ہے اور ہماری قوم کی بھی۔

ہماری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ طلبہ سے کسی کو کیا پرخاش ہو سکتی ہے؟ اگر کسی کو ان سے پرخاش کے لئے کوئی وجہ نہیں ہے تو آخر حکومت ہی کی ایسی کیا مت ماری ہوئی ہے کہ وہ ان سے کوئی پرخاش رکھے۔ وہ اگر کوئی ضابطہ اور قاعدہ نافذ کرتی ہے تو بہرحال اس لئے نافذ کرتی ہے کہ اداروں میں نظم اور ڈسپلن کا قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح کی کسی چیز کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ حکومت یا منتظمینِ تعلیم اقتدار منوانا یا طلبہ کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ کوئی عاقل آدمی اس قسم کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ نظم اور ڈسپلن کے قیام سے اصلی فائدہ طلبہ ہی کو پہنچتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ طلبہ کسی قانون کو ضرر

سے زیادہ سخت محسوس کریں لیکن وہ یہ کیوں نہیں محسوس کرتے کہ جن لوگوں نے اس قانون کو نافذ کیا ہے وہ نہ تو اُن کے دشمن ہیں اور نہ مصالح اور حالات کے سمجھنے میں ان سے فروتر ہیں۔ تعلیم، تعلیم کی ضروریات، تعلیم کے مراحل، تعلیم کے لئے نصاب، تعلیمی اداروں کے ضوابط اور ان کے امتحانات، نتائج اور ڈگریوں کے شرائط اور مدارج کو سمجھنا اور ان کا فیصلہ کرنا تعلیمی ذمہ داروں کا کام ہے یا طلبہ کا؟ اگر ان میں سے کسی بات کے متعلق طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے زیادہ مفید فلاں بات ہے تو اس کو ادب و احترام کے ساتھ اپنے تعلیمی ذمہ داروں کے سامنے رکھیں اور اُن کے فوائد اُن کو سمجھائیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ان کی بات میں معقولیت ہوگی تو آخر پڑھے لکھے اور ذمہ دار لوگ معقول بات قبول کرنے سے کیوں انکار کریں گے؟ لیکن بالفرض وہ نہیں مانتے تو طلبہ یہ کیوں خیال نہیں کرتے کہ وہ اپنے سے زیادہ سن رسیدہ، تعلیم یافتہ اور تجربہ کار لوگوں کو اپنی بات کی معقولیت سمجھانے سے قاصر رہے! اس وجہ سے ممکن ہے کہ ان کی اپنی ہی رائے غلط ہو۔ اور بالفرض وہ اپنی رائے غلط ماننے پر تیار نہیں تو اُس کے لئے آئینِ شائستہ اپنی جد و جہد جاری رکھیں۔ ان کی بات میں معقولیت ہوئی تو آج نہیں تو کل مان لی جائے گی لیکن یہ کیوں ضروری ہو جاتا ہے کہ اُس کو بزور منوانے کے لئے مظاہرے اور ہڑتالیں، نعرے اور ہنگامے، پتھر توڑ پھوڑ، اور لاٹھی چارج اور آنسو گیس تک نوبت آجاتی ہے۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ تعلیمی اداروں میں اگر مضبوط ڈسپلن نہ ہو تو طلبہ کا مزاج ایسا ہو جاتا ہے کہ "دیوانہ را ہوئے بس است" جہاں کسی شریر نے انگلی دکھائی اچھے بُرے سب اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ طلبہ میں بُروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ بُرے تو شاید سو میں دو چار ہوتے ہیں لیکن نوجوانی کی ناتجربہ کاری اور عنفوانِ شباب کے الھڑ پن کی وجہ سے اکثریت کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ فتنوں اور ہنگاموں سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔ ظاہر ہے کہ ڈسپلن کے استحکام کے نقطہ نظر سے اگر کوئی ضابطہ نافذ ہوتا ہے تو اس سے مقصود اچھوں کو نقصان پہنچانا نہیں ہوتا بلکہ اچھوں کو بُروں اور ہنگامہ پسندوں کے شر سے بچانا ہوتا ہے۔ یونیورسٹی آرڈیننس سے ہمارے ان عزیزوں کو بڑی شکایت ہے کہ اس کے تحت حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ وہ کسی کی ڈگری روک لے سکتی ہے لیکن اوّل تو جہاں تک ہمیں علم ہے اب تک اس اختیار کے استعمال کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا ہے اور پیش آتے بھی کیوں۔ آخر حکومت کو لوگوں

کی ڈگریاں روکنے سے ایسی کیا دلچسپی ہوسکتی ہے ؟ پھر اس طرح کے قوانین کی ضرورت تو ان چند شرپسندوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو نہ تو خود چین سے کام کرتے ، نہ دوسروں کو کام کرنے دیتے۔ اس طرح کے عناصر ڈگری تو درکنار اس بات کے بھی سزاوار نہیں ہیں کہ کسی تعلیمی ادارے کے پاس بھی پھٹکنے پائیں۔ آخر تعلیمی ادارے شرارت کے اڈے تو نہیں ہیں ! انہی پر قوم کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے اور ان پر قوم لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرتی ہے۔ حکومت اور تعلیمی کارفرماؤں کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان کے ماحول کو حتی الامکان غیر مطلوب عناصر سے پاک رکھیں۔

پھر اگر طلبہ کو کچھ شکایات ہیں تو ان شکایات کو قرینے کے ساتھ پیش کریں۔ ان کی شکایات پر غور کرنے کے لئے صدر ریاست نے خود ایک کمیشن مقرر کر دیا ہے۔ طلبہ کو اس بات سے خوش ہونا چاہیئے اور اپنی زحمتیں اور تکلیفیں اس کے سامنے رکھنی چاہئیں۔ اس بات کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ کمیشن طلبہ کی واجبی شکایات کو کیوں اہمیت نہ دے گا اور بالفرض وہ طلبہ کے کسی مطالبے کو اہمیت نہ دے تو آخر طلبہ خود اپنے رویّہ پر نظر ثانی کے لئے تیار کیوں نہیں رہتے۔ آخر ہمارے ان عزیزوں کا یہ ذہن کیوں بنتا جا رہا ہے کہ انہیں ساری دنیا سے بدگمانی ہے بجز ان لوگوں کے جو ان کی پیٹھ ٹھونکیں اور ان کے ہر غلط صحیح مطالبہ کی تائید کریں۔ وہ اس بات کے خواہشمند کیوں ہیں کہ ان کی ہر خواہش کے آگے حکومت گھٹنے ٹیک دیا کرے اور ان کے سارے مطالبے بے چون و چرا تسلیم کر لیا کرے۔ آخر وہ کبھی اس پہلو سے معاملے پر کیوں نہیں غور کرتے کہ حکومت کی ذمہ داریاں اُن سے زیادہ ہیں اور تعلیمی ذمہ داروں کا وقار و احترام بھی ایک اہمیت رکھنے والی شے ہے۔

عزیز طلبہ تک اگر ہمارا کوئی مشورہ پہنچ سکے تو ہم انہیں نہایت محبت کے ساتھ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنی ساری توجہ تعلیم پر مرکوز کریں۔ ان کا لمحہ لمحہ نہایت قیمتی ہے۔ جب تک کوئی ایسی بات ذمہ داروں کی طرف سے نہ ہو جس کی زد براہ راست طلبہ کے ایمان و اخلاق پر پڑتی ہو (جس کا اندیشہ بہت کم ہے) اس وقت تک وہ بلا وجہ اپنے آپ کو انتشار میں مبتلا نہ کریں۔ طالب العلمی کے دور میں ان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سیاست سے صرف علمی و نظری حد تک تعلق رکھیں ، اپنے

ماحول سے باہر کے سیاسی ہنگاموں سے عملاً کوئی تعلق نہ رکھیں۔ ان ہنگاموں میں دلچسپی لینے کے لئے ان کے پاس آیندہ بڑی فرصت ہوگی طالب العلمی کے دور میں وہ اپنے آپ کو اس قابل بنائیں کہ اپنے ملک و قوم کی کوئی خدمت کرسکیں۔ یہ کام بڑی بِتّہ ماری، بڑی ریاضت اور کامل یکسوئی کا ہے۔ جو طلبہ طالب العلمی کے زمانے ہی میں لیڈری کا دھندا اختیار کرلیتے ہیں وہ مولانا محمد علی مرحوم کے بقول پکنے سے پہلے ہی سڑ جاتے ہیں۔ ہماری قوم کو ایسے سڑے ہوئے لیڈروں کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ قابل اور پختہ کار و پختہ کردار لیڈروں کی ضرورت ہے۔

اپنے مطالبات منوانے کے لئے فاقہ کشی کی رسم جو ہمارے ہاں چل پڑی ہے اس سے بھی ہمیں شدید اختلاف ہے۔ جب ہم کسی کالج یا یونیورسٹی کے طلبہ کے متعلق یہ سنتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے فاقہ شروع کر رکھا ہے تو ہمیں اس سے روحانی اذیّت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بات منوانے کے اس طریقے کو فروغ گاندھی جی کے ذریعے سے ہوا اور اب ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اس نے ایک بلائے علم کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ گاندھی جی ایک بڑے آدمی تھے اس لئے ان کی یہ ادا نبھ گئی، ورنہ ہے یہ طریقہ بات منوانے کا نہایت نامعقول۔ ہر حساس آدمی کو کسی کی فاقہ کشی سے بالخصوص نوجوانوں اور بچّوں کی فاقہ کشی سے نہایت درجہ قلق ہوتا ہے۔ اپنا حال تو یہ ہے کہ اخبار میں اس نوع کی کسی خبر کے پڑھنے سے بھی دل پارہ پارہ ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس طرح اپنے آپ کو اذیّت میں مبتلا کرے تو اس اذیت سے متاثر ہوکر ایک معقول آدمی ایسے شخص کے کسی نامعقول مطالبے کو کس طرح تسلیم کرے بالخصوص جبکہ اس مطالبے کو ماننے سے دوسرے بہتوں کی زندگیاں بھی متاثر ہوتی ہوں؟ آخر ایسے شخص میں اور بمبئی کے گداگروں کے اس گروہ میں کیا فرق ہے جو سوال کرتے ہیں اور سوال کے ساتھ اپنے کپڑوں میں آگ لگا لیتے ہیں کہ اگر ان کا سوال نہ پورا کیا گیا تو وہ جل مریں گے۔

ہمارے نزدیک بات منوانے کا یہ طریقہ نامعقول بھی ہے اور غیر اسلامی بھی۔ اسلامی روایات اور اسلامی تاریخ میں اس کی کوئی مثال ہمیں نہیں ملتی۔ عزیز طلبہ اور طالبات سے بڑی محبّت کے ساتھ ہماری یہ گذارش ہے کہ وہ ضد کے اس طریقے کو بالکل چھوڑ دیں۔ لیڈر حضرات اور اخبارات

سے بھی ہماری یہ التجا ہے کہ وُہ کسی نوعیت ہے اس قسم کے کسی اقدام کی حوصلہ افزائی نہ کریں قطع نظر اس سے کہ بالواسطہ یہ اقدام خودکشی کی حوصلہ افزائی ہے اس کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے قوم کے کردار میں ایک غلط رجحان نمایاں ہوتا ہے جو غیر عقلی بھی ہے اور غیر مردانہ بھی۔

سیاسی پارٹیوں سے ہم نے پہلے بھی گذارش کی ہے اور آج پھر گذارش کرتے ہیں کہ خدارا وہ طلبہ کو اپنے سیاسی اغراض کا آلہ کار نہ بنائیں۔ اس سے صرف طلبہ ہی کا مستقبل برباد نہیں ہوتا بلکہ پوری قوم کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔ تعلیمی پالیسی اور تعلیمی نظام میں جو تبدیلی یا اصلاح کسی پارٹی کو مطلوب ہو اس کے لئے وہ جدوجہد کے مناسب طریقے اختیار کرے لیکن ہر سیاسی پارٹی کا اللہ اور قوم سے یہ مضبوط عہد ہونا چاہئیے کہ وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں میں کسی پہلو سے بھی طلبہ کو ملوّث نہیں کرے گی اور نہ تعلیمی منتظمین کے بالمقابل طلبہ کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کرے گی۔ اس دوران میں اپوزیشن پارٹیوں کا رویہ طلبہ کے معاملے میں ہم نے نہایت غیر ذمہ دارانہ بلکہ نا عاقبت اندیشانہ دیکھا ہے۔ تعلیمی ذمہ داروں کے مقابل میں غیر ذمہ دار سیاسی طالع آزما جب طلبہ کے ساتھ اظہار ہمدردی کی نمائش کرتے ہیں تو یہ چیز ایسی ہی معلوم ہوتی ہے جس طرح حقیقی ماں کی تادیبی تنبیہات کے مقابل میں کسی بچے کی سوتیلی ماں نمائشی شفقت کا اظہار کرے۔ اس طرح کی باتیں حالات کو خراب کرتی اور بچوں کے مزاج کو بگاڑتی ہیں۔ ہم نے پہلے بھی کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ طلبہ کو سیاسی اغراض کے لئے اکسانا بچوں کے اغوا سے کم جرم نہیں ہے۔ طلبہ کو عملی سیاست سے الگ ہی رکھنے میں مصلحت ہے بالخصوص جبکہ قوم کے سامنے موت وزیست کا کوئی مسئلہ بھی درپیش نہ ہو۔ یہ بات کچھ ہمارے سیاسی عدم توازن کی غمازی کرتی ہے کہ ہمارے ہاں ہر مسئلہ نفیر عام کا مسئلہ بن جاتا ہے اور ہم ہر ہنگامہ کو اسی کے لئے قید دیکھنا چاہتے ہیں تعجب ہے کہ یہ حال سیاسی معاملات میں ان قوموں کا نہیں ہے جن کی ہم سیاست میں تقلید کرتے ہیں۔

(۵)

اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے ہونے کا تو دعویٰ نہیں رکھتے جو دس سال بعد پیش آنے والے کو دس سال پہلے ہی دیکھ لینے والی آنکھیں رکھتے ہیں لیکن چونکہ ایسے بزرگوں کی آنکھیں دیکھے

یں اس وجہ سے ان کے فیض روحانی سے کوئی کوئی پیشین گوئی اپنی بھی سچی نکل ہی آتی ہے۔ خواجہ صاحب
فرما گئے ہیں ؎

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

یاد ہوگا ہم نے متحدہ محاذ کے عناصر خمسہ کے اتحاد کو "بھنڈ کوں کی پنسیری" سے تشبیہ دی تھی اور
عرض کیا تھا کہ یہ اتحاد ع اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند

اب دیکھئے یہ پیشین گوئی کس طرح حرف بحرف پوری ہو رہی ہے۔

اس اتحاد کے کچھ اساطین نے اب کھلم کھلا یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ وہ ملک میں سوشلسٹ نظام کے
داعی رہے ہیں۔ اسی کو وہ حق سمجھتے ہیں اور متحدہ محاذ کو بھی وہ اسی راہ پر لانے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔
ز نکاتی پروگرام والی بات اب شاید انہیں یاد بھی نہیں رہی۔ یہ ملحوظ رہے کہ عددی اور معنوی دونوں ہی اعتبارات
سے اب یہی گروپ ہے جس کو محاذ کی قیادت حاصل ہے۔ دوسرے حضرات، خاص طور پر مدعیانِ دین کی
حیثیت، اس میں نہ پہلے کچھ تھی نہ اب اس سے کچھ زیادہ ہو سکی ہے کہ ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است!

کچھ در پردہ پاکستان مسلم لیگ سے محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ نرم گرم کچھ اس
سے معاملہ ہو جائے۔ پاکستان مسلم لیگ بھی غالباً یہ سوچ رہی ہے کہ

اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام

کچھ یہ سوچ رہے ہیں کہ سب پارٹیاں اپنی اپنی انفرادیت ختم کر کے ایک وحدت میں منظم ہو جائیں اور
قائد اعظم والی مسلم لیگ کو حیات تازہ بخشیں اور "مادرِ ملت" اس کی قیادت فرمائیں اور سب ایک ماں
باپ کی اولاد کی طرح خاندان کی عزت کا جھنڈا لہرائیں

تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری!

جو حضرات "رفع اضطرار" کے لئے متحدہ محاذ میں شامل ہوتے تھے ان کا اضطرار غالباً رفع ہو گیا۔
ب وہ تسکین حاصل کر کے متحدہ محاذ کے خیر و شر سے کچھ بے تعلق سے نظر آ رہے ہیں۔ ویسے سنا ہے کہ اب

موجودہ معاشرہ کے متعلق بھی ان کی رائے وہ نہیں رہی ہے جو ۷ جنوری سے پہلے تھی۔ ۲ جنوری کی صبح بلکہ دوپہر تک تو یہ معاشرہ اسلام اور جمہوریت دونوں ہی کے لئے تڑپ رہا تھا صرف مٹھی بھر مغرب زدہ ارباب اقتدار تھے جو اس کی راہ روکے ہوئے تھے۔ اب سنتے ہیں، ہزار میں سے نوسو ننانوے اس کے افراد اسی طرح جاہل، دین سے عاری، جمہوریت سے بے شعور اور بکنے اور فروخت ہو جانے والے بن گئے ہیں جس طرح قیام پاکستان کے وقت تھے۔ ظاہر ہے کہ راتوں رات اس ملک کے معاشرے میں جو انقلاب ہوا ہے وہ کوئی معمولی حادثہ نہیں ہے۔ اب یہ بیچارے معاشرہ کی فکر کریں یا متحدہ محاذ کی۔

واقعہ یہ ہے کہ ایسے دور بین اور دیدہ ور لیڈر کسی قوم کو نصیبوں سے ملتے ہیں؛

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اب یہ حضرات تو کمبل کو چھوڑنا چاہتے ہیں لیکن شاید کمل انہیں نہ چھوڑے۔ اور اس کے ساتھ انہیں ڈوبنا ہی پڑے۔

(۶)

پچھلے کئی مہینوں سے ان صفحات میں حلقہ تدبر قرآن کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ ذکر نہ آنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کا کام معطل ہے۔ الحمد للہ تمام مصروفیات کے ساتھ ساتھ اس کا کام بھی پوری پابندی کے ساتھ جاری ہے۔ رمضان کے مہینہ میں ارادہ تھا کہ قرآن مجید پورا ختم ہو جاتے لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ ڈھائی تین پارے باقی رہ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ میں نے چاہا کہ اب طلبہ کو ابواب حکمت سے بھی آشنا کیا جائے تاکہ اسی سلسلے میں یہ کام بھی ہو جاتے۔ خاص اس موضوع پر مجھے الگ لکچرز دینے پڑیں۔ اس چیز کے سبب سے درس کی مقدار باعتبار کیفیت اگرچہ کم نہیں رہی لیکن باعتبار کمیت اندازے سے کم رہی۔ اب یہ طلبہ چونکہ قرآن مجید کے اکثر حصے سے گزر چکے ہیں اور حدیث شریف بھی پڑھ چکے ہیں اس وجہ سے اس بات کے اہل ہیں کہ ہر موضوع پر قرآن کے فلسفہ کے مبادی بھی ان کے سامنے لائے جائیں۔ ان شاء اللہ عید الاضحیٰ تک اس کام سے بھی فراغت ہو جائیگی

یہ ملحوظ رہے کہ قرآن سے متعلق جو کچھ میرے سینے میں تھا وہ میں نے اپنے امکان کے حد تک ان عزیزوں کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں استاذ مرحوم کا فکر بھی شامل ہے اور جو کچھ میں خام و پخ

اس میں اضافہ کر سکا ہوں، وہ بھی ہے۔ اب اس کو پکانا، ہضم کرنا، اس کے صحیح و سقیم میں امتیاز کرنا، اس سے فائدہ اٹھانا، اس کو ترقی دینا اور آنے والی نسلوں تک اس کو پہنچانا ان کا کام ہے۔ میں نے مفت پایا تھا، مفت ان کو دیا ہے اور سیدنا مسیحؑ کے الفاظ میں ان کو وصیت کرتا ہوں کہ "تم نے مفت پایا ہے مفت بانٹنا" انہی الفاظ میں میرے استاذؒ نے مجھے وصیت کی تھی۔ میری دلی دعا ہے کہ یہ اس علم کے حامل بنیں اور ان کے ذریعے سے یہ دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچے۔

اب ہمارے نقشہ کار کے لحاظ سے دو کام پہلے گروپ کے طلبہ کے اور باقی ہیں جو ہمیں انجام دینے ہیں۔ ایک فقہ کا کام، دوسرا حجۃ اللہ البالغہ کا۔ فقہ کا کام تو شروع ہو چکا ہے اور ان طلبہ کی استعداد کو سامنے رکھتے ہوئے میں توقع رکھتا ہوں کہ اس میں زیادہ وقت نہیں صرف ہوگا۔ یہی حال ان شاء اللہ حجۃ اللہ البالغہ کا ہوگا۔ صرف شاہ صاحبؒ کے انداز بیان اور انداز فکر سے ذرا مانوس ہونے کی ضرورت ہے پھر یہ ساری منزل ان شاء اللہ خود طے کرلیں گے۔

اس گروپ کی خدمت سے فارغ ہونے کے بعد بشرط صحت و زندگی میں دوسرے گروپ کی خدمت میں لگ جاؤں گا اور امید ہے کہ اس کا کام میرے لئے نسبتہً آسان ہوگا اس لئے کہ فارغ رفقا ان کی تربیت میں میرا ہاتھ بٹائیں گے۔ چنانچہ اس وقت بھی ان کی ابتدائی تربیت کا کام انہی کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔

تین سال کے تجربہ کے بعد پورے اطمینان قلب کے ساتھ اب میں یہ اعلان کرنے کی پوزیشن میں ہوں کہ نئی تعلیم یافتہ نسل کو دین کی تعلیم دینے کا یہ نہایت کامیاب راستہ ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے۔ بس ایک شرط ہے وہ یہ کہ تعلیم و تربیت کی ذمہ داری جس شخص پر ڈالی جائے وہ خود اس کام کا اہل ہو۔ جو حضرات اس قسم کے حلقے قائم کرنے کے ارادے کر رہے ہیں وہ ذی استعداد آدمی تلاش کرنے کی کوشش ضرور کریں باقی ترتیب کار اور نصاب وغیرہ کے معاملے میں ان شاء اللہ ہم ضروری رہنمائی کرتے رہیں گے۔

(۷)

جو حضرات مجھے آئے سیدھے خطوط لکھ رہے ہیں ان کا ایک جامع جواب میں نے پچھلے میثاق میں دے دیا ہے۔ اب جو لوگ نام بنام جواب کے لئے مصر ہیں ان کے جواب میں گزارش ہے

کریں میں نے میثاق کے منیجر صاحب کو ہدایت کر دی ہے کہ ایسے تمام خطوط مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیئے جایا کریں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ کسی کے خلاف میرے دل میں تکدر پیدا ہو۔ پہلے میں اس طرح کے کرسٹ نامے سرسری طور پر پڑھ لیا کرتا تھا، اب بالکل نہیں پڑھتا، اور آئندہ ہرگز نہیں پڑھوں گا۔ ہمارے قومی اخلاق کے زوال کا ایک پہلو یہ بھی ہے جس کو دیکھ کر دل کڑھتا ہے۔ آخر دل کڑھانے سے کیا حاصل! ایک صاحب میرے "علاج" کے لئے بہت فکرمند ہیں، ان سے سیدنا مسیح کے لفظوں میں عرض ہے کہ "طبیب پہلے اپنا علاج کر"!

بقیہ: اجتماعیات و سیاسیات

جی! مقتدر قیادت کے خلاف بے اعتمادی کا واضح کرشمہ نہیں بلکہ یہ طرزِ عمل خود اعتمادی کے فقدان اور شکست خوردگی کا مظہر ہے اس سے ہمیں اپنے اس دوست کی یاد آتی ہے جو بی۔ اے (انگریزی) کے امتحان میں فیل ہو گئے تو فرمانے لگے کہ میرے فیل ہونے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ میں لفظ "شیکسپیئر" کے ہجے غلط لکھتا تھا!

اب تک میرا روئے سخن زیادہ تر حزبِ اختلاف کی جانب رہا ہے مگر آئندہ سطور کی مخاطب دراصل تو حزبِ اقتدار ہوگی مگر حزبِ اختلاف بھی ایک طرح سے اس سے متعلق ہوگی کیوں کہ پیشِ نظر آئینی اصلاحات سے پاکستان میں جمہوریت ہی کا صدارتی طرزِ حکومت رائج ہو سکے گا جس کے تعلق میں حزبِ اختلاف کی کوششیں بھی درکار رہیں گی۔

اس موضوع پر مزید خامہ فرسائی طویل اور گہری غور و فکر کی مقتضی ہے اس لئے میں اسے کسی آئندہ صحبت پر اٹھا رکھتا ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ امریکی آئین اور برطانوی آئین یا صدارتی اور پارلیمانی نظام کا موازنہ نہ کیا جائے۔ نیز آئین پاکستان کے سرسری مطالعہ سے جو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ صدر مملکت کو آمر بنا دیا گیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں پاکستان میں عدلیہ، مقننہ اور عملیہ کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے اور پھر مثبت تجاویز پیش کرکے یہ بتایا جائے کہ موجودہ نظام کو جمہوریت کا صدارتی نظام کیوں کر بنایا جا سکتا ہے اور ان سطور میں ہمارے اس ادعا کا کہ حزبِ مخالف صدارتی نظام کو قبول کرنے کیا مفہوم ہے؟

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

۲

تفسیر سورۂ آل عمران

۲۔ آگے کا مضمون آیات (۷ - ۱۷)

قرآن کے نزول کی ضرورت واضح کرنے کے بعد اب یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں جو اس قرآن کا انکار کر رہے ہیں اور وہ کیا چیزیں ہیں جن کو وہ اپنے اس انکار کے لئے بہانہ بنا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں فرمایا ہے کہ انکار کی راہ اُن لوگوں نے اختیار کی ہے جن کے دلوں میں کجی اور جن کی طبیعتوں میں فتنہ پسندی ہے۔ اپنے اس ذوق کی وجہ سے وہ قرآن کی اصل تعلیمات سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ وہ اس میں صرف ایسی چیزیں ڈھونڈھتے ہیں جن کی آڑ لے کر وہ قرآن کے خلاف لوگوں کے دلوں میں کچھ شبہات و شکوک پیدا کر سکیں اور اس طرح خود بھی راہ حق سے گریز اختیار کریں اور جس حد تک اُن کا زور چلے دُوسروں کو بھی اس سے بدکائیں۔ چنانچہ ان کی ساری دلچسپی محکمات کے بجائے صرف متشابہات سے ہوتی ہے اس لئے کہ اِن کا تعلق آخرت کی زندگی کی تمثیلات و تشبیہات سے ہوتا ہے، ان کے اندر موشگافی اور کریدی کر کے کوئی ایسی بات نکالی جا سکتی ہے جو خود ان کی ضلالت کے لئے بھی ایک بہانہ بن سکے اور دُوسروں کو بھی اس سے فتنے میں مبتلا کیا جا سکے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جن کے اندر علم و عقل کی پختگی موجود ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی آیات کی قدر کرتے ہیں اور اس کی تعلیمات و ہدایات سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہ قرآن کے محکمات کی طرح اس کے متشابہات کی بھی قدر کرتے ہیں اور ان کو

اعتراض و فتنہ جوئی کا ذریعہ بنانے کے بجائے ان کو اضافۂ علم کا ذریعہ بناتے اور ان پر صدق دل سے ایمان لاتے ہیں۔ اگر کوئی بات اپنی فہم کی گرفت سے ماورا پاتے ہیں تو اس کی حقیقت و ماہیت کے درپے ہونے اور اس کو فتنہ بنانے کے بجائے اس کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں کہ یہی رویہ علم و ایمان کی پختگی کا مقتضیٰ ہے۔ نیز ان کے اندر آخرت کا پختہ یقین ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ شیاطین کی وسوسہ اندازیوں سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے برابر دعا بھی کرتے رہتے ہیں کہ ایمان کی دولت سے بہرہ یاب فرمانے کے بعد وہ اُن کو کسی گمراہی میں پڑنے سے محفوظ رکھے۔

اس کے بعد گمراہی کے ان اسباب کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اُن کے پچھلے ہم مشربوں کی تباہی کے باعث ہوئے اور ساتھ ہی مسلمانوں کی کامیابی کے بعض تازہ واقعات کا حوالہ دے کر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اگر ان واقعات سے انہوں نے عبرت نہ پکڑی تو ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو پچھلوں کا ہو چکا ہے۔

اس کے بعد ان حجابات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اُن کے اور قرآن کے درمیان آج حائل ہیں اور ساتھ ہی ان کی بے حقیقتی اور بے ثباتی کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ دنیائے فانی کی جن چیزوں پر ریجھ کر قرآن سے منہ موڑ رہے ہو ان کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ان کے پیچھے بھاگنے کے بجائے ابدی زندگی کی نعمتوں اور خدا کی خوشنودی کے طالب بنو جس کی راہ صبر، سچائی، اطاعت الٰہی، انفاق فی سبیل اللہ اور استغفار سے کھلتی ہے اور قرآن اسی راہ کی طرف بلانے کے لئے نازل ہوا ہے۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷-۱۰

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ
شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۲
قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ
مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ يُـؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۱۳
زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّھَبِ
وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ
حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝۱۴ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ
بِالْعِبَادِ ۝۱۵ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۶ اَلصّٰبِرِيْنَ
وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝۱۷ -

وہی ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری جس میں محکم آیات ہیں جو اصل کتاب کا درجہ رکھتی ہیں اور دوسری کچھ آیتیں اس میں ایسی ہیں جو متشابہ ہیں۔ تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس میں سے متشابہات کے درپے ہوتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کریں حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تو جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم اُن پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے رب ہی کے پاس سے ہیں۔ اور یاد دہانی تو اہلِ عقل ہی حاصل کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت بخشنے کے بعد کج نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش، تو نہایت بخشنے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! تو سب لوگوں کو ایک ایسے دن کے لئے جمع کرکے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔" (۷ - ۹)

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، نہ ان کے مال خدا کے ہاں کچھ کام آئیں گے، نہ ان کی اولاد۔ اور وہی لوگ دوزخ کے ایندھن بنیں گے۔ اُن کا بھی وہی حال ہونا ہے جو آلِ فرعون اور ان لوگوں کا ہوا جو ان سے پہلے گزرے۔ انھوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا اور اللہ سخت پاداش والا ہے۔ (۱۰ - ۱۱)

ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا ہے یہ کہہ دو کہ تم مغلوب ہوگے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے

اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ جن دو گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی ان کی سرگزشت میں تمہارے لئے نشانی ہے ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، دوسرا کافر تھا، یہ ان کو کھلم کھلا ان سے دوگنے دیکھتے تھے اور اللہ جس کی چاہتا ہے اپنی تائید سے مدد فرماتا ہے، اس میں آنکھیں رکھنے والوں کے لئے بصیرت ہے۔ (۱۲-۱۳)

لوگوں کی نگاہوں میں مرغوباتِ دنیا عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے چوپائے اور کھیتی، کھبا دی گئی ہیں۔ یہ دنیوی زندگی کے سروسامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ ان سے کہو، کیا میں تمہیں ان چیزوں سے بہتر چیز کا پتہ دوں؟ جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لئے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوشنودی ہوگی۔ اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ہے۔ جو یہ دعا کرتے رہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار، ہم ایمان لائے پس تو ہمارے گناہوں کو بخش اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ جو صابر، راستباز، فرماں بردار، راہِ خدا میں خرچ کرنے والے اور اوقاتِ سحر میں مغفرت چاہنے والے ہیں۔ (۱۴-۱۷)

۳- الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ؔۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ (وہی خدا ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری) سے اشارہ اس عزیز و حکیم اور حیّ و قیوم خدا کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور اس سے مقصود ہمارا مخاطب کو کئی چیزوں کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

ایک تو اس عظیم رحمت کی طرف اشارہ کرنا ہے جو اس کتاب کی شکل میں ظہور میں آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات حیات و قیومیت کا ظہور ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو زندگی جاوداں

سے بہرہ مند اور ان کو جادہ حق پر استوار کرنے کے لئے یہ کتاب اتاری ہے۔ اس عظیم نعمت کا حق یہ ہے کہ بندے اس کی قدر پہچانیں، اس پر ایمان لائیں اور اس کے ذریعے سے حیات جاوداں اور بقائے دوام حاصل کریں۔

دوسرے اس میں ان لوگوں کے لئے تخویف و تہدید کا پہلو بھی ہے جو اس کی نذر دید و تکذیب کریں گے۔ اس لئے کہ جس خدا نے یہ کتاب اتاری ہے وہ عزیز بھی ہے اور قیوم بھی۔ اس کی اس عزت و حکمت اور اس قیومیت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ان لوگوں کو سزا دے جو اس کے قانون حق و عدل کی راہ میں مزاحم ہوں۔

تیسرے اس سے نفس کتاب کے مزاج کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ ایک خدائے عزیز و حکیم کا کلام ہے اس وجہ سے یہ خود بھی عزیز و حکیم ہے۔ چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ اس کی صفت عزیز و حکیم آئی بھی ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کتاب الجھنے اور موشگافی کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ بقدر ظرف و توفیق فائدہ اُٹھانے کے لئے ہے۔ آدمی اس ناپیدا کنار سمندر کی حکمتوں سے جو فائدہ اُٹھا سکے اُٹھا لے، یہ توقع نہ کرے کہ وہ اس کے تمام اسرار و حقائق کا احاطہ کر سکتا ہے۔ اس کی جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں ان کو فتنہ اور شبہات و شکوک کا ذریعہ نہ بنائے بلکہ ان کو اللہ کے حوالہ کرے۔

اس آیت میں چند الفاظ ایسے استعمال ہوتے ہیں جن کی نوعیت کچھ قرآنی اصطلاحات کی سی ہے۔ چونکہ آیت کا ٹھیک ٹھیک مفہوم اس وقت تک واضح نہیں ہو سکے گا جب تک ان اصطلاحات کا مفہوم اچھی طرح واضح نہ ہو جائے اس وجہ سے پہلے ہم ان کی وضاحت کرتے ہیں۔

آیات محکمات

آیات محکمات : سے مراد قرآن کی وہ آیات ہیں جو آفاق و انفس کی بالکل بدیہیات، خیر و شر کے مسلمات، اور معروف و منکر کے قطعیات و یقینیات پر مشتمل ہیں۔ جن کو دل قبول کرتے ہیں اور ان کو قبول کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی شرط نہیں ہے کہ دل سلیم ہو۔ جن کے حق میں ہر عقل گواہی دیتی ہے بشرطیکہ اس پر تعصب، جذبات اور غیر فطری عقلیات کے پردے پڑے ہوئے نہ ہوں۔ انہی محکمات پر ہر صحیح مذہب کی بنیاد ہوتی ہے اس وجہ سے تمام آسمانی مذاہب اور تمام انبیاء سے یہ تواتر کے ساتھ نقل ہوتی ہیں۔ چونکہ فطرت انسانی کے اندر ان کی جڑیں نہایت مستحکم ہوتی ہیں شبہات و شکوک کی آندھیاں اُن کو ہلانے سے قاصر رہتی ہیں اس وجہ سے قرآن نے ان کو محکمات سے تعبیر کیا ہے۔

ام الکتاب کا مفہوم

اُمّ الکتاب:- آیاتِ محکمات کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ ان کی حیثیت ام الکتاب کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بقیہ ساری کتاب کا مرجع و مرکز وہی محکمات ہوتی ہیں، انہی پہ ساری بحث کا مدار ہوتا ہے۔ ساری شاخیں انہی سے پھوٹتی ہیں۔ اگر کوئی نزاع و اختلاف پیدا ہوتا ہے تو اس کا فیصلہ بھی انہی کی کسوٹی پہ پرکھ کر ہوتا ہے۔ پھر انہی کا یہ درجہ ہوتا ہے کہ ان کو اصول قرار دے کر ان سے مسائل مستنبط کئے جائیں اور ان مسائل پر اسی طرح اعتماد کیا جائے جس طرح اصولوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

متشابہات سے مراد

متشابہات:- متشابہات سے مراد وہ آیتیں ہیں جن میں ہمارے مشاہدات و معلومات کے دسترس سے باہر کی باتیں تمثیلی و تشبیہی رنگ میں قرآن نے بتائی ہیں۔ یہ باتیں جس بنیادی حقیقت سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں وہ بجائے خود واضح اور مبرہن ہوتی ہے، عقل اس کے اتنے حصے کو سمجھ سکتی ہے جتنا سمجھنا اس کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ البتہ چونکہ اُس کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہوتا ہے اس وجہ سے قرآن اُن کو تمثیل و تشبیہ کے انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ علم کے طالب بقدر استعداد ان سے فائدہ اُٹھالیں اور ان کی اصل صورت و حقیقت کو علمِ الٰہی کے حوالہ کریں۔ یہ باتیں خدا کی صفات و افعال یا آخرت کی نعمتوں اور اس کے آلام سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں۔ ان کا جس حد تک ہمارے لئے سمجھنا ضروری ہے اتنا ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اور اس سے ہمارے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اگر ہم اپنی حد سے آگے بڑھ کر ان کی اصل حقیقت اور صورت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کریں تو یہ چیز فتنہ بن جاتی ہے اور اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے ذہن سے شک کا ایک کانٹا نکالنا چاہتا ہے اور اس کے نتیجے میں بے شمار کانٹے اُس کے اندر چبھا لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس نایافتہ کی طلب میں اپنی یافتہ دولت کو بھی ضائع کر بیٹھتا ہے اور نہایت واضح حقائق کی اس لئے تکذیب کر دیتا ہے کہ اُن کی شکل و صورت ابھی اس کے سامنے نمایاں نہیں ہوئی۔ قرآن نے اسی چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ (بلکہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جو اُن کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور ابھی تک اس کی حقیقت ان کے سامنے ظاہر نہیں ہوئی ہے) یونس - ۳۹

ہم یہاں قرآن سے اس قسم کے بعض متشابہات کی مثالیں نقل کرتے ہیں۔ سورۂ مدثر میں قرآن نے دوزخ کے عذاب کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ه وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ه لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ه لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ه عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ه (۲۶ - ۳۰)

میں اس کو دوزخ میں داخل کروں گا اور تمہیں کیا پتہ کہ دوزخ کیا ہے؟ وہ نہ ذرا ترس کھائے گی اور نہ کسی چیز کو چھوڑے گی اجسموں کو جھلس دینے والی ہوگی۔ اس پر خدا کے انیس سرہنگ مقرر ہوں گے۔

اس آیت میں جس سزا کا ذکر ہے وہ ایک حقیقت ہے اور قانون مجازات پر جس کا ایمان ہو اس کے لئے اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں، رہی اس کی تفصیل تو اس کا تعلق چونکہ ایک نادیدہ عالم سے ہے اس وجہ سے اس کی اصل صورت کسی طرح ہماری گرفت میں نہیں آسکتی۔ اس طرح کے معاملات میں صحیح روش یہ ہے کہ آدمی اتنے پر قناعت کرے جو سمجھ میں آتا ہے۔ جو سمجھ میں نہیں آتا وہ اس عالم میں سمجھ میں نہیں آسکتا، اس وجہ سے اس کے درپے ہونے کے بجائے اس کو خدا کے حوالے کرے۔ سلیم الطبع انسان ایسا ہی کرتے ہیں لیکن جن کے دلوں میں کجی اور عقلوں میں ٹیڑھ ہوتی ہے وہ یہ روش اختیار کرنے کے بجائے متشابہات و تمثیلات کی حقیقت معلوم کرنے کے درپے ہوجاتے ہیں جس سے وہ خود بھی فتنوں میں پڑتے ہیں اور اپنے جیسے دوسرے بھتوں کو بھی فتنوں میں ڈال دیتے ہیں چنانچہ دیکھئے مذکورہ بالا آیت میں 'تسعۃ عشر' جو لفظ آیا تو قرآن نے اس کے متعلق شرارت پسندوں کا ردعمل یہ بتایا ہے کہ وہ اسی کے درپے ہوگئے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے فرشتے مراد ہیں تو یہ سوال انہوں نے اٹھایا کہ انیس کے عدد کی تخصیص میں کیا رمز ہے؟ قرآن نے ان کے اس ردعمل پر ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ

اور ہم نے دوزخ کی پہرہ داری پر نہیں مقرر کئے ہیں مگر فرشتے، اور ہم نے ان کی تعداد کو نہیں بنایا مگر کافروں کے لئے فتنہ۔ تاکہ وہ لوگ یقین کریں جن کو کتاب ملی ہے اور ایمان والے اپنے ایمان میں اضافہ کریں اور کتاب پانے والے اور اہل ایمان شک میں نہ پڑیں۔ اور جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جو کافر ہیں وہ یہ کہیں کہ اس قسم کی تمثیل سے اللہ تعالیٰ کا کیا مطلب ہے؟

بِهٰذَا مَثَلًا ۚ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۚ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝ (۳۱ ۔ مدثر)

اسی طرح اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور یہ نہیں ہے مگر انسانوں کے لئے یاد دہانی۔

اسی طرح سورہ بقرہ میں جنت کی نعمتوں کا تمثیلی رنگ میں ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب اہل جنت کے سامنے جنت کی نعمتیں پیش کی جائیں گی تو وہ خوشی سے پکار اٹھیں گے کہ یہ تو وہی نعمتیں ہیں جن کی ہمیں پہلے سے قرآن میں سیر کرا دی گئی تھی، قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (۲۵۔ بقرہ) (وہ پکاریں گے، یہ تو وہی چیز ہے جو ہمیں اس سے پہلے بخشی گئی اور وہ دیے جائیں گے اس سے ملتی جلتی) یعنی جنت کی نعمتوں کا ذکر جو تمثیلات و متشابہات کے رنگ میں قرآن میں ہوا ہے اس سے اہل ایمان کو تو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں بیٹھے ہوئے ایک سیر جنت کی کر لیتے ہیں لیکن انہی تمثیلات و متشابہات سے متعلق فتنہ جو یوں اور ضلالت پسندوں کے رویہ کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ (۲۶۔ البقرۃ)

اللہ اس بات سے نہیں جھجکتا کہ کوئی تمثیل بیان کرے خواہ وہ کسی مچھر کی ہو یا اس سے بھی کسی چھوٹی چیز کی، تو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ یہ حق ہے اور ان کے پروردگار ہی کی جانب سے ہے لیکن جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کی تمثیلیں پیش کرنے سے اللہ تعالیٰ نے کیا چاہا ہے؟ اللہ ان تمثیلوں سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور ان سے بہتوں کو راہ یاب کرتا ہے اور ان سے نہیں گمراہ کرتا مگر انہی لوگوں کو جو خدا کی نافرمانی کرنے والے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آیات متشابہات سے مراد قرآن کی وہ آیتیں ہیں جن میں یا تو آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں میں سے کسی نعمت و نقمت کا بیان تمثیلی و تشبیہی رنگ میں ہوا ہے یا خدا کی صفات و افعال میں سے کوئی بات تمثیلی اسلوب میں پیش ہوئی ہے۔ مثلاً آدم میں خدا کا اپنی روح

یا حضرت عیسیٰؑ کو بن باپ کے پیدا کرنا وغیرہ۔ اس طرح کی آیات سے جیسا کہ اوپر بیان ہوا اہلِ ایمان کے علم و ایمان میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جن کی طبیعتوں میں فتنہ پسندی ہوتی ہے وہ انہی کے اندر موشگافیاں کر کے بہت سے فتنے پیدا کر لیتے ہیں۔

تاویل :- تاویل کا لفظ بھی اس آیت میں ذرا ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے یہاں مراد مذکورہ بالا قسم کی کسی بیان کردہ شے کی حقیقت اور اس کی صورت ہے۔ جس مفہوم میں یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے اسی مفہوم میں سورہ یوسف میں استعمال ہوا ہے قَالَ يٰاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا، (اس نے کہا اے میرے باپ یہ ہے میرے اس خواب کی حقیقت جو میں نے اس سے پہلے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اس کو واقعہ ثابت کر دکھایا) (یوسف ۔۔ ۱۰۰)

یہاں چند باتیں بطور تنبیہ اور بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے اس راہ کی ساری الجھنیں ان شاء اللہ دُور ہو جائیں گی۔

ایک یہ کہ اس آیت میں اسلوب کلام حصر کا نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ نہیں گمان نہیں کرنا چاہیے کہ بس قرآن کی آیات دو ہی قسموں، محکمات اور متشابہات، ہی میں تقسیم ہیں۔ یہاں صرف انہی دونوں قسموں کا ذکر دو متقابل قسموں کی حیثیت سے ہوا ہے اور مقصود ان کے ذکر سے محض فتنہ پسندوں اور ہدایت پسندوں کے اختلاف ذوق کو نمایاں کرنا ہے کہ جو طبیعتیں فتنہ پسند ہوتی ہیں ان کی ساری دلچسپی صرف متشابہات سے ہوتی ہے تاکہ ان کے ذوق فتنہ جوئی کے لئے کوئی غذا فراہم ہو سکے۔ برعکس اس کے جو علم و معرفت کے طالب ہوتے ہیں اور جن پر حقیقت پسندی کا رنگ، غالب ہوتا ہے ان کی اصلی دلچسپی محکمات سے ہوتی ہے۔ جہاں تک متشابہات کا تعلق ہے ان کا جتنا حصہ ان کی سمجھ میں آتا ہے اس سے وہ فائدہ اُٹھاتے ہیں، جو حصہ سمجھ میں نہیں آتا اُس کی صورت و ہیئت معلوم کرنے کے پیچھے نہیں پڑتے بلکہ اس کو خدا کے حوالے کر لیتے ہیں۔ محکمات کی بدولت چونکہ ان کے قدم علم میں بہت راسخ ہو جاتے ہیں اس وجہ سے اس طرح کی چیزیں ان کو متزلزل نہیں کرتیں۔ قرآن میں ان دو قسموں کے علاوہ بھی آیات ہیں لیکن مقصود یہاں چونکہ آیات قرآنی کی تمام انواع کا احاطہ نہیں ہے اس وجہ سے ان کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ مثلاً قصص قرآن،

امثالِ قرآن، تلمیحات و اشارات - یہ چیزیں نہ توام الکتاب کے درجے اور مرتبے کی ہیں اور نہ ان کو ان متشابہات کے درجے میں رکھنا صحیح ہے جن کی تاویل میں غور و فکر کرنا ممنوع ہو۔

دوسری یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن کی آیات کا محکم و متشابہ ہونا ہرگز بلحاظ الفاظ نہیں ہے بلکہ صرف بلحاظ معنی ہے۔ قرآن اپنے الفاظ اور اپنی زبان کے اعتبار سے، تمام تر عربی مبین میں ہے۔ الفاظ کی تاویل میں جو اختلافات ہوئے ہیں وہ بالعموم تین اسباب سے ہوئے ہیں۔ یا تو غور و تحقیق میں کوتاہی ہوئی ہے، یا کسی غلط عقیدہ کی بیجا عصبیت اس کا باعث ہوئی ہے، یا عربی زبان سے ناواقفیت اس کا سبب بنی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اس طرح کے کسی سبب سے کوئی الجھن پیدا ہوتی ہو تو اُس پر غور و فکر عربی زبان کے معروف و مسلّم قواعد و ضوابط کی روشنی میں ہونا چاہیئے، یہ ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن پر غور و فکر ممنوع ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ متشابہات ہوں یا محکمات، قرآن میں یہ دونوں قسمیں ممیّز اور معلوم ہیں۔ یہ بات نہیں ہے، جیسا کہ بعض متکلمین نے گمان کیا ہے کہ یہ دونوں غیر ممیز ہیں اور نہ یہ بات ہے کہ الفاظ کی اپنے معانی پر دلالت کوئی مشتبہ اور مشکوک چیز ہے۔ جن لوگوں نے ایسا سمجھا ہے انہوں نے بالکل غلط سمجھا ہے۔ ان میں سے پہلی بات تو صریحاً غلط ہے اور دوسری بات نہایت مبہم ہے جو سرے سے قرآن ہی سے مایوس کر دینے والی ہے حالانکہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے نور و برہان بنا کر اتارا ہے۔ جو باتیں عالمِ غیب سے تعلق رکھنے والی ہیں ان کے متعلق خدا نے ہماری ضرورت کے حد تک خبر دے دی ہے، اس کا جو حصہ ہم سے محجوب رکھا گیا ہے بس اس کی تاویل پردۂ خفا میں ہے۔

چوتھی یہ کہ قرآن نے یہاں محکم اور متشابہ کا ایک خاص مفہوم مراد لیا ہے جو ان کے لغوی مفہوم سے ایک حد تک الگ ہے۔ بعض دوسرے مقامات میں بھی قرآن میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں جہاں اُن کے لغوی مفہوم مراد ہیں۔ مثلاً محکم سے مراد وہ کلام ہے جو جامع، واضح اور موجز ہو اس صورت میں اس کا مقابل لفظ مفصل آتا ہے مثلاً كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (ھود-۱) (یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں، پھر اُن کی تفصیل کی گئی خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے) سنت الٰہی یہ رہی ہے کہ شروع شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیمات و ہدایات قول محکم کی شکل میں اتاریں تاکہ وہ ذہن و حافظے میں اچھی طرح راسخ ہو سکیں اور دل اور زبان دونوں کے لئے

وہ ہلکی پھلکی محسوس ہوں۔ پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ذریعے سے ان کی تفصیل فرما دی۔ اسی طرح متشابہ کا ایک عام مفہوم بھی ہے وہ یہ کہ ایک دوسری سے ملتی جلتی ہم آہنگ و ہم رنگ چیزیں۔ اپنے اس مفہوم کے اعتبار سے پورا قرآن متشابہ ہے۔ چنانچہ اسی پہلو سے قرآن کو کتاب متشابہ کہا گیا ہے۔ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۔ (زمر۔۲۳)

پانچویں یہ کہ جس طرح قرآن محکمات و متشابہات دونوں ہی قسم کی آیات پر مشتمل ہے اسی طرح عالم انفس اور عالم آفاق میں جو نشانیاں ہیں وہ بھی محکمات و متشابہات دونوں ہی پر مشتمل ہیں۔ ان کے باب میں بھی ارباب علم اور اہل زیغ کا رویہ وہی ہوتا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ جن کے ذہن و فکر میں پختگی ہوتی ہے وہ محکمات سے اطمینان و یقین حاصل کرتے ہیں اور متشابہات سے شبہات و شکوک میں گرفتار ہونے کے بجائے ان کو خدا کے علم و حکمت کے حوالے کرتے ہیں اور اپنے علم کی کوتاہی کا اقرار کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ ان متشابہات کو اپنی اور دوسروں کی گمراہی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس مسئلے پر مفصل بحث ان شاء اللہ ہم سورہ کہف کی تفسیر میں کریں گے۔ غزوہ احد کے واقعہ کو بھی، جیسا کہ ہم تمہیدی بحث میں اشارہ کر چکے ہیں، ایک متشابہ واقعہ کی نوعیت حاصل ہے، چنانچہ اس جنگ کے بعد اس عظیم آیت کا اترنا اس کائنات کی ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لئے تھا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جس طرح غزوہ بدر حق و باطل کے درمیان ایک یوم فرقان تھا جس سے اہل ایمان کے قلوب اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر مطمئن ہوئے اور اس نے ایک آیت محکم بن کر اہل کفر پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری کر دی اسی طرح غزوہ احد کی حیثیت ایک آیت متشابہ کی ہے اس لئے کہ اس میں بظاہر باطل کو حق پر غلبہ حاصل ہوا جس سے کفار کو یہ گمان ہوا کہ جنگ میں کامیابی و ناکامی کا تعلق صرف تدابیر اور اسباب و وسائل ہی سے ہے۔ اس میں نہ خدا کو کوئی دخل ہے اور نہ اس کا کوئی تعلق حق اور باطل سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک شدید قسم کی غلط فہمی تھی، جس کا دور ہونا نہایت ضروری تھا چنانچہ جب اس کے دور کرنے کے لئے مناسب وقت آگیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں یہ دور فرمائی اور یہ اس سلسلے کی ایک عظیم آیت ہے۔

زیغ کی حقیقت

اس آیت میں زیغ کا جو لفظ آیا ہے مختصراً اس کی حقیقت بھی سمجھ لینی چاہیئے۔

زیغ کے اصل معنے میل یعنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں۔ یہ لفظ بیک وقت دو مفہوموں کا حامل ہے۔ ایک کجی اور دُوسرے سقوط۔ کوئی چیز جو کھڑی ہو جب جھک جاتی ہے تو گرنے سے قریب ہوجاتی ہے۔ یہ حالت اس رُسوخ کے برعکس حالت ہے جو اس آیت میں راسخون فی العلم کی بیان ہوئی ہے۔

یہود کی کج روی کا آغاز

یہ زیغ یُوں تو اہلِ ضلالت کی عام بیماری ہے لیکن اہلِ کتاب اس مرض میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ مبتلا رہے ہیں۔ یہود کی تاریخ گواہ ہے کہ وُہ شروع ہی سے اس بیماری میں مبتلا ہے۔ اور ان کے زیغ کا یہ پہلو خاص طور پر نہایت سنگین ہے کہ وُہ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں اس میں مبتلا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے سبب سے خُدا کے غضب میں مبتلا ہوئے۔ قرآن میں اس بات کا ذکر ہوا ہے۔ سورہ صف میں اس کا ذکر اس طرح ہُوا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (صف - ۵)	اور یاد کرو جب مُوسٰی نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، تم مجھے کیوں دُکھ پہنچا رہے ہو جبکہ تم اچھی طرح یہ جان چکے ہو کہ میں تمہاری طرف رسُول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پس جب وہ کج ہوگئے تو خُدا نے بھی ان کے دل کج کر دیے اور اللہ بدعہدوں کو ہدایت نہیں بخشتا۔

یہی یہود ہیں جنہوں نے کلمۃ اللہ اور اسی قسم کے بعض دوسرے الفاظ کی خفیفت کی تشریح میں فلسفیانہ قسم کی موشگافیاں پیدا کر کے ان کو ایک گورکھ دھندا بنایا جس سے نصاریٰ کے لئے گمراہی کی راہیں کھلیں اور وہ حضرت مسیحؑ کی اُلوہیت کے عقیدے میں مبتلا ہوئے۔ بعد میں نصاریٰ اس گمراہی پر مزید اضافہ بُت پرست قوموں کی تقلید سے ہوا اور پھر آہستہ آہستہ وہ حق سے دُور ہوگئے کہ اس سے ان کا رشتہ ہی منقطع ہوگیا اور وہ صریح کفر میں مبتلا ہوگئے۔ چنانچہ

عیسائیوں کی کج روی

قرآن نے ان کے بارے میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ تو وہی مسیح بن مریم ہے) (مائدہ ۵-۴۲)

یہود اور نصاریٰ کی گمراہی کی نوعیت میں بس یہ فرق ہے کہ یہود کی گمراہی اصلاً عملی ہے

نصاریٰ کی اعتقادی۔ اس فرق کی وجہ سے حق کی مخالفت میں ان کا رویہ بھی ایک دوسرے سے مختلف رہا۔ یہود تو قرآن کو حق جاننے کے باوجود اس کی مخالفت کرتے تھے۔ نصاریٰ جس طرح تورات اور انجیل کے متشابہات میں پڑنے کی وجہ سے گمراہ ہوئے تھے اسی طرح قرآن میں بھی ان کی ساری دلچسپی بس متشابہات ہی سے تھی۔ انہی میں موشگافیاں کرکے وہ طرح طرح کے فتنے پیدا کرتے اور اس طرح اپنی گمراہی کا بھی سامان کرتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے۔ قرآن کے محکمات سے نہ انہوں نے خود دلچسپی لی اور نہ ان لوگوں کو دلچسپی لینے دی جن پر اُن کا بس چلا۔ الغرض قلب ونظر کے زیغ اور متشابہات کی پیروی کے باب میں تھے تو یہود و نصاریٰ دونوں ایک ہی سطح پر یہ بیماری ان میں مشترک تھی لیکن ان کے ذوقی رجحانات ذرا الگ الگ تھے۔ یہود ابتغائے فتنہ سے زیادہ رغبت رکھتے تھے اور نصاریٰ ابتغائے تاویل سے۔ یہ گمراہیاں چونکہ دنیا کے تمام گمراہوں میں مشترک ہیں اس وجہ سے قرآن نے اسلوب بیان عام ہی رکھا ہے تاکہ کلام میں وسعت پیدا ہو سکے۔ یہود ونصاریٰ کی تخصیص نہیں کی۔ لیکن قرآن کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اشارہ انہی کی طرف ہے۔ یہی انداز سورہ فاتحہ میں بھی ہے۔ اس میں بھی مغضوب علیہم اور ضالین کے الفاظ ہرچند عام ہیں اور ان کے عام ہونے کی وجہ سے ان میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے لیکن ان کا خاص اشارہ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔

متشابہات کی پیروی کی ایک مثال

متشابہات کی پیروی کی وجہ سے نصاریٰ جس قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے اس کو ایک مثال سے واضح کرنا مفید رہے گا۔

قرآن اور انجیل دونوں اس امر میں باہم متفق ہیں کہ حضرت مسیحؑ کلمۃ اللہ ہیں۔ کلمۃ اللہ کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اس سے امر و حکم کی تعبیر کی جاتی ہے۔ حضرت مسیحؑ کی پیدائش چونکہ فطرت کے عام ضابطے کے خلاف ہوئی تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے کلمہ سے تعبیر کیا یعنی اُن کی ولادت اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کُن" سے ہوئی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ اصل شے کسی چیز کے واقع ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ کا حکم ہی ہے۔ اسباب محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ یہ بات قرآن میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے اور اس میں کسی قسم کا ایچ پیچ نہیں ہے جس سے کسی صاف ذہن کے آدمی کے اندر کوئی اُلجھن پیدا ہو سکے۔ قرآن نے نہایت غیر مبہم الفاظ میں فرمایا ہے۔ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (آل عمران ۵۹) بے شک عیسیٰ کی مثال

اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسی آدم کی، آدم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ ہو جا بس وہ ہو گیا) یعنی آدم کو کلمۂ کن، کے ذریعے سے حی و ناطق بنایا۔ اسی چیز کو دوسری جگہ نفخ روح سے تعبیر فرمایا ہے۔ بعینہٖ یہی معاملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے۔

نصاریٰ نے اس واضح بات میں جو تحریف کی اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب ان کو بت پرست قوموں سے سابقہ پیش آیا اور ان کے ساتھ ان کی مذہبی بحثیں شروع ہوئیں تو انہوں نے ان پر یہ اعتراض شروع کیا کہ تم تو ایک مصلوب خدا کی پرستش کرتے ہو، ہم تم سے ہزار درجے افضل ہیں اس لئے کہ ہم آسمانی دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ نصاریٰ نے اپنے حریفوں کے اس اعتراض سے بچنے کیلئے یہ کوشش کی کہ اپنے عقیدے کو بھی انہی کے عقیدے کے سانچے میں ڈھال دیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے یہ دعوے کیا کہ مسیح تو ابن اللہ ہیں، وہ مخلوق نہیں ہیں۔ اپنے اس نئے عقیدے کی آرائش میں انہوں نے ایک طرف تو یونانیوں، مجوسیوں اور ہندوؤں کے فکر و فلسفہ سے مواد لیا اور دوسرے ان یہودی متکلمین کے علم کلام سے رہنمائی حاصل کی جو یہود کے آخری دور کی پیداوار تھے اور جو نہ صرف خالق اور مخلوق کے درمیان وسائل و وسائط کے قائل تھے بلکہ ان کو مستقل ذوات کا درجہ دیتے　　اور ان کو کلمۃ اللہ کہتے تھے۔ نصاریٰ نے بعینہٖ یہی عقیدہ حضرت عیسیٰؑ کے لئے اختیار کر لیا۔ کچھ عرصے تک تو بات اسی حد تک رہی لیکن آہستہ آہستہ گمراہی سے گمراہی پیدا ہونی شروع ہوئی اور انہوں نے ان کو خدا کا کفو، اسی کے جوہر سے اور ازل سے اس کے ساتھ قرار دے دیا۔ اور پھر اس عقیدے کی تائید کے لئے انجیل یوحنا کے آغاز میں تحریف کے چور دروازے سے بعض عبارتیں بھی داخل کر دیں تاکہ باہر سے برآمد کئے ہوئے اس عقیدے کے لئے گھر کی ایک دلیل بھی فراہم ہو جائے۔

لفظ الا اللہ پر وقف

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ (اور اس کی اصل حقیقت نہیں جانتا ہے مگر اللہ) اوپر کی تفصیلات سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ یہاں وقف ہے۔ یہی مذہب جمہور اہل سنت کا ہے اور یہی حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، مالک بن انسؒ، کسائی اور فراء سے منقول ہے۔ البتہ شیعہ اور بعض متکلمین یہاں وصل کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک متشابہات کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں۔ اس کی وجہ، جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے، وہ تو یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اماموں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کو ہر بات کا علم ہوتا ہے۔ رہے دوسرے لوگ جو

اس بات کے قائل ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ تاویل سے مراد معنی لیتے ہیں حالانکہ آیت کا سیاق و سباق اس کے خلاف ہے۔ اوپر اس کی وضاحت واضح ہو چکی ہے[1]

اگرچہ آیت کے الفاظ اور اس کے مختلف اجزا کی اس وضاحت کے بعد آیت کی صحیح تاویل خود بخود سامنے آگئی ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر مزید اطمینان کے لئے ہم اس کا واضح مفہوم بھی پیش کئے دیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ وہی خدا جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی، جو زندہ بھی ہے اور قیوم بھی۔ اسی نے تورات اور انجیل اتاریں۔ پھر جب ان میں گھپلا کر دیا گیا تو اس کی حکمت اور قیومیت مقتضی ہوئی کہ یہ قرآن اتارے تاکہ اس کے ذریعے سے حق و باطل میں امتیاز ہو سکے تو جو لوگ اس کی مزاحمت کریں گے وہ یاد رکھیں کہ خدائے عزیز حق کو مظلوم نہیں چھوڑے گا، وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔

اس کے بعد اس بات کی وضاحت فرمائی کہ اہلِ کتاب جو اس فرقان کی مخالفت کر رہے ہیں تو اس کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ فی نفسہٖ اس کتاب میں کوئی بات ایسی ہے جو ان کی وحشت کا باعث ہو رہی ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے اپنے دلوں میں کجی ہے۔ اس کجی کے سبب سے ان کو اس کتاب کے محکمات سے جن کی حیثیت اصل کتاب کی ہے اور جن پر اس کی تمام تعلیمات اور اس کے سارے حکمت و فلسفہ کی بنیاد ہے، کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ انہیں اگر دلچسپی ہے تو بس اس کی ان آیات متشابہات سے ہے جن میں کوئی بات تمثیلی و تشبیہی رنگ میں بتائی گئی ہے۔ وہ اپنی طبیعت کے بگاڑ کے سبب سے انہی کے درپے ہوتے ہیں اور فساد انگیزی اور فتنہ آرائی کے لئے ان کی صورت و حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں جس حد تک ان کا علم ضروری ہے وہ خدا نے کھول دیا ہے، بس اتنے پر قناعت کرنی چاہیئے، ان کی اصل حقیقت کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرنا چاہیئے، وہ اس دن کھلیں گی

---

[1] ان مطالب کا اکثر حصہ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے ماخوذ ہے، صرف بعض مطالب کی توضیح میری طرف سے ہے۔ اس وجہ سے اس کی صحیح باتیں مولانا کی طرف منسوب کیجئے اور اگر کہیں خامی ہو تو اس کی ذمہ داری تنہا میرے سر ہے۔

جس دن وہ سامنے آئیں گی۔ جو لوگ علم میں راسخ ہیں ان کی روش متشابہات کے معاملے میں یہی ہے۔ وہ محکمات اور متشابہات دونوں کو اپنے رب ہی کا عطیہ سمجھتے ہیں اور دونوں پر یکساں ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اپنے علم کی پختگی کی وجہ سے اس رمز سے واقف ہیں کہ آیات الٰہی کا مقصود بندوں کو یاددہانی ہے اور چونکہ وہ عقل رکھتے ہیں اس وجہ سے ان سے جو فائدہ اُٹھانا چاہیئے وہ فائدہ اُٹھاتے ہیں، کسی سعی نامراد و لاطائل میں اپنا وقت برباد کر کے اپنے خسران کے اسباب نہیں فراہم کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ اس کی آیات سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو عقل رکھتے ہیں اور اس عقل سے صحیح طور پر کام لیتے ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

ان دونوں آیتوں میں کوئی لغوی یا نحوی اشکال نہیں ہے۔ 'زیغ' کے لفظ کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔ یہ راسخین فی العلم کی دُعا ہے جس سے اس امر کا اظہار ہو رہا ہے کہ وہ اپنے دین کے معاملے میں اتنے بے پروا نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ شبہات اور شکوک کو بلا دے بھیج کر بلائیں اور اپنے ایمان و اسلام کو خطرے میں ڈالیں بلکہ وہ اپنے ایمان کی سلامتی کے لئے برابر اپنے پروردگار سے دُعا کرتے رہتے ہیں کہ دین میں ان کے جمے ہوئے قدم اکھڑنے نہ پائیں اور جب فتنوں کی یورش ہو تو خدائے وہاب اپنے پاس سے ان کے لئے وہ رُوحانی کمک بھیجے جو ان کے ثباتِ قدم کا ذریعہ بنے۔

دوسری آیت میں اس یقین کا اظہار ہے جو ان راسخین کے اندر آخرت کے باب میں ہوتا ہے۔ موقعِ کلام یہاں اشارہ کر رہا ہے کہ درحقیقت یہی یقین ہے جو دل اور عقل دونوں کا اصلی پاسبان ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کے ذہن و فکر کو کوئی چیز بھی ہر زہ گردی سے نہیں روک سکتی۔ وہ زندگی کو ایک نہایت سہل بازی سمجھتا ہے اور ہر داؤں پر اس کو لگا دینے کے لئے تیار رہتا ہے لیکن جن کے اندر آخرت کا یقین رچا بسا ہوتا ہے وہ ہر قدم احتیاط کے ساتھ اٹھاتے اور نہایت پھونک پھونک کر رکھتے ہیں۔ یہ احتیاط ان کو ہمیشہ جادہ مستقیم پر استوار رکھتی ہے۔

اجتماعیات و سیاسیات

اب فضلِ من اللہ صاحب

پاکستان میں صدارتی نظامِ حکومت کے استحکام کی ضرورت

میری ناچیز رائے میں اب پاکستان، جمہورِ پاکستان اور پاکستان میں اسلام کا خوشگوار مستقبل مقتضی ہیں کہ حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار دونوں یہاں صدارتی طرزِ حکومت کے قیام کی ضرورت کو بطیبِ خاطر قبول کریں۔

صدارتی نظام کیوں؟

صدارتی نظام کی حمایت میں قلم اُٹھاتے وقت میرے پیشِ نظر ایک بھرپور فکری پس منظر بھی ہے جس کو بشرطِ ضرورت آئندہ کبھی پیش کیا جائے گا۔ لیکن سرِدست میں دو حقیقتوں کی جانب توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں اوّل یہ کہ آئینِ اسلامی جمہوریہ پاکستان (مجریہ ۱۹۶۲ء) اب ایک حقیقتِ ثابت بن چکا ہے لہٰذا اس میں مذکور نظام کو قبول کر لینا چاہیئے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مارچ ۱۹۶۲ء میں اس کا نفاذ ہوا تھا، جب سے اب تک اس کے تحت اس ملک میں انتخابات بھی ہو چکے ہیں اور قوم نے اس کی تائید بھاری اکثریت سے بھی کر دی ہے، بلاشبہ یہ آئین منزل من اللہ نہیں۔ مگر ۱۹۶۲ء میں جب یہ نافذ ہوا تو اسے ملک کی فوجی قیادت کی تائید حاصل تھی اور شروع ہی میں مشرقی پاکستان میں اس آئین کے انعدام کا آوازہ اگرچہ اُٹھا مگر جلد ہی صدا بصحرا ثابت ہو گیا کیونکہ اس کی پشت پر کوئی انقلابی طاقت تو کجا ملک کے جمہور کی رائے عامہ کی طاقت بھی نہ تھی۔

پھر یہی نہیں اگر یہ آئین اس قدر ناپسندیدہ تھا کہ اس کا خاتمہ ضروری تھا تو حزبِ مخالف پر لازم آتا تھا کہ وہ اس کی مخالفت میں زبانی طور پر ڈٹے رہتے اور انتخابات میں عملاً شریک نہ ہوتے مگر ایک طرف تو تنسیخِ آئین کا مطالبہ اصلاحِ آئین میں بدل گیا اور دوسری طرف مخالفین نے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ بھی کر لیا چونکہ یہ فیصلہ دیر میں ہوا تھا لہٰذا اس کا نقصان حزبِ اختلاف والوں ہی نے نہیں ملک و ملت نے بھی اُٹھایا۔ پاکستان میں مضبوط بنیادوں پر اُستوار حزبِ اختلاف

وجود میں نہ آسکی اور اس خلا کو زیادہ تر لا جماعتی یا آزاد امیدواروں نے پُر کیا اور اس طرح ایک تو ان آزاد امیدواروں کے باعث مجالسِ قانون ساز میں سیاسی جماعتوں کے خلاف ایک تعصب قائم رہا دوسرے برسرِکار آئین سے تعاون نہ کرنے کے سبب سے ملک کا سیاسی مزاج عدم توازن کی نذر ہو گیا۔

اس سلسلہ میں میرے پیشِ نظر دوسری حقیقت کا تعلق بنیادی طور پر آئین سے ہے۔ ہمارے موجودہ آئین کے آرٹیکل ۱۵۵ تا آرٹیکل ۱۵۸ میں حقِ بالغ رائے دہی اور انتخابی ادارہ کے انتخابات کا ذکر ہے۔ پھر آرٹیکل ۱۶۵ اور آرٹیکل ۱۶۸ میں بالترتیب صدر مملکت اور اراکین مجلس قانون ساز (مرکزی اور صوبائی) کے انتخاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ آئین کے ان آرٹیکلوں میں مذکور نظام حکومت امریکہ کے صدارتی نظام سے مشابہ مگر برطانیہ کے پارلیمانی نظام سے مختلف ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ حالیہ صدارتی انتخابات میں متحدہ حزبِ اختلاف نے پارلیمانی نظام کو اپنایا، اسے اپنے انتخابی منشور میں جگہ دی اور اس طرح ووٹروں کو اپنی طرف بلانے کا سامان پیدا کیا۔ پھر بعض اخبارات میں اب تک یہ بحث چل رہی ہے (یا چلائی جا رہی ہے) کہ پارلیمانی نظام ہی پاکستان کی ضروریات کو بطریقِ احسن پورا کرتا ہے۔ ان حالات میں درج ذیل تین سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) آیا اخبارات میں پارلیمانی نظام کے حق میں اظہارِ رائے نیز حزبِ مخالف کی جانب سے اسے اپنے انتخابی منشور میں جگہ دینا نیز اسے ووٹوں کے حصول کے تعلق میں آلۂ کار بنانا آئینِ مملکت کے اس حصہ کی جو ایک مختلف طرزِ حکومت کو ملک کے لئے لازم ٹھہراتا ہے، کھلم کھلا خلاف ورزی نہیں؟

(ب) آیا آئینِ مملکت کے جزو دوم میں مندرجہ بنیادی حقوق اس درجہ وسیع ہیں کہ وہ افراد بھی ان کے دائرہ حفاظت کے اندر متصور ہوتے ہیں جو ٹھیک اس آئین کی (جو ان بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے) کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہیں؟

اس سوال کا جواب دیتے وقت آئین حصہ دوم، شق سوم "آزادی تقریر" کے تحت ذیل کی ضمن بھی لائقِ توجہ ہے:-

"آزادی اظہارِ رائے:- ہر شہری کو تقریر اور اظہارِ خیال کی آزادی ہوگی لیکن ایسی

مناسب پابندیوں کے ساتھ جو پاکستان کی سلامتی، غیر ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات، امن عامہ، اخلاق و شائستگی برقرار رکھنے، توہین عدالت، ازالہ حیثیت عرفی، یا جرم پر اکساہٹ سے باز رکھنے کے لئے قانوناً عاید کی جائیں۔"

(حوالہ:- آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان حصہ دوم۔ باب اوّل، بنیادی حقوق)

ظاہر ہے کہ آئین مملکت جن بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے آٹھ پابندیاں ان پر حد بندیاں عاید کرتی ہیں اور آئین پاکستان کے ایک اہم حصہ کی خلاف ورزی کرنے والا شخص ان کی پناہ تلاش نہیں کر سکتا۔

(ج) ایک ایسے نظام حکومت کے تعلق میں، جو ٹھیک ہے اُس نظام حکومت کے جو آئین مملکت میں مذکور ہے، اظہار خیال نیز ایک جماعت کو اُسے اپنے انتخابی منشور کا جزو بنا کر آیا صدر مملکت اپنے اُس حلف کے ایک حصہ سے اغماض تو نہیں برتتے جو اُنہوں نے صدر منتخب ہونے کے فوراً بعد اُٹھایا تھا اور جس میں یہ الفاظ بھی موجود تھے "یہ کہ میں آئین کی بقا، حفاظت اور تحفظ کی ہر ممکن سعی کروں گا۔"

آئینی پہلو سے ہٹ کر عملاً ملک و ملت اِس طرز عمل کے نتیجہ میں حسب ذیل مصائب کا شکار ہوتی ہے :-

(د) اِس طرح ملک کا سیاسی مزاج خواہ مخواہ عدم توازن اور انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اہل ملک یہ طے نہیں کر پاتے کہ اُن کے وطن عزیز کے لئے کون سا نظام حکومت پسندیدہ ہے۔ صدارتی نظام یا پارلیمانی نظام اور اِس طرح ملک میں برسر اقتدار نظام اور اُس کے چلانے والوں کے خلاف ایک کشمکش جاری رہتی ہے۔

(ر) انتخابات کا معرکہ بھی توازن سے محروم ہو جاتا ہے اور اس طرز عمل کے باعث انتخابات منصفانہ نہیں ہو پاتے۔ محض ایک مخصوص نظام پر عمل پیرا ہونے کے باعث برسر اقتدار جماعت پر آمریت کا جھوٹا الزام عاید کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا جاتا ہے اور دوسرا فریق محض ایک مختلف نظام کا علمبردار ہونے کے باعث شہادت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح جذبات میں شدت اور سیاسی فضا میں کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

پاکستان کی موجودہ قیادت پر آمریت کے الزام کو ابھی جھوٹا کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں میرے پاس دو دلیلیں ہیں۔ اوّل اس ملک کی عدلیہ کا آزاد ہونا دوسرے مقننہ کا با اختیار ہونا۔ اوّل الذکر کے متعلق بس یہ کہنا کافی ہے کہ مشرقی پاکستان کی عدالت عالیہ نے بہت سے ایسے سیاسی نظر بندوں کی رہائی کے احکام صادر کئے جنہیں وہاں کی حکومت نے امتناعی قوانین کے تحت نظر بند کیا تھا اور ہماری سپریم کورٹ نے جماعت اسلامی کو خلاف قانون جماعت قرار دینے والے حکومتی حکم کو کالعدم قرار دیا۔ آخرالذکر کے بارے میں اس قدر کہنا کافی ہے کہ آئین پاکستان (پہلی ترمیم) ایکٹ جس وقت مسودہ قانون کی حیثیت میں زیر بحث تھا اُس وقت جناب سید قمرالحسن نے متعلقہ کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے ایک اختلافی نوٹ لکھا تھا۔ اس نوٹ میں قومی مقننہ کے اس فاضل رکن نے یہ بیان کیا تھا کہ حکومت چاہتی تھی کہ کوئی نو سو قوانین کو بنیادی حقوق کے اثر سے بچا لے مگر حزبِ اختلاف کی کوششوں کے سبب وہ اس میں ناکام رہی اور نو سو میں سے کوئی پچاس قوانین ہی محفوظ رہ سکے۔

پس ان حالات میں حزبِ اختلاف کے لئے دانشمندی کا راستہ یہی ہے کہ وہ پاکستان میں صدارتی نظام کے قیام کو ایک حقیقت ثانیہ کی حیثیت سے قبول کر لے اور اسی نظام کے تحت آئندہ قومی اور صوبائی مجالسِ قانون ساز کے انتخابات لڑے۔ تاکہ ملک کا سیاسی مزاج عدم توازن تذبذب اور انتشار سے محفوظ ہو جائے۔ ملک میں ایک صحتمند حزبِ اختلاف وجود میں آئے اور ملک ایک مسلمہ نظام حکومت کے تحت ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

صدارتی نظام قبول نہ کرنے کے برے نتائج:- چونکہ ابھی تک تخاطب حزبِ اختلاف سے ہی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیکھا جائے ماضی میں صدارتی نظام قبول نہ کرنے کے کیا بُرے نتائج نکلے۔ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۶۲ء میں آئین نافذ ہوا تو اوّل اوّل مشرقی پاکستان سے نئے آئین کے انہدام کے حق میں آوازہ اٹھا۔ جب یہ بے وقت کی راگنی ثابت ہوا تو پھر ترمیم آئین کا غلغلہ بلند کیا گیا۔ اس سے متصل زمانہ میں عام انتخابات ہوئے تو پہلے ان میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ ہوا اور پھر بالکل آخری لمحوں میں حصہ لینے کا فیصلہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حزبِ اختلاف تو ان انتخابات میں شریک نہ ہو سکی البتہ خلا کو "آزاد"

امیدواروں نے پُر کیا اور اس سے وطن عزیز کو یہ نقصان پہنچا کہ یہاں کوئی منظم اور مؤثر حزب
اختلاف وجود میں نہ آسکی اور یہاں صحتمند جمہوری روایات کے آغاز کے لئے آئندہ انتخابات پر
قدغنیں لگ گئیں۔ پھر چونکہ آزاد اُمیدوار یا لا جماعتی اُمیدوار بکثرت آئے تھے اس لئے سیاسی
جماعتوں کے خلاف عملاً ایک فضا ملک میں قائم رہی اور اس سے ملک میں مایوسی بھی پھیلی اور سیاسی
مزاج کی تربیت بھی نہ ہوئی۔

۱۹۶۴ء میں جب صدارتی انتخاب کی نوبت آئی تو حزبِ اختلاف نے پھر فکری افتراق سے
ٹھوکر کھائی کچھ پارلیمانی نظام کی کوشش مگر زیادہ تر مادرِ ملت کی قیادت کے باعث متحدہ حزبِ اختلاف
دراتوں رات شہرت تو حاصل ہو گئی مگر جب نوبت بنیادی جمہوریت کے اراکین تک پہنچی تو صورت
حال یہ ہو گئی کہ براہِ راست انتخابات پر مبنی پارلیمانی نظام کے قیام کو اپنا انتخابی نصب العین اور
منشور قرار دیا مگر عملاً صدارتی نظام اور وہ بھی بنیادی جمہوریتوں کے اراکین پر مبنی انتخابی ادارہ کے توسط
سے انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا۔ بلاواسطہ طرزِ انتخاب کا مطلب یہ تھا کہ بنیادی جمہوریتوں کو ختم
کیا جائے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ وہ شخص کا اندھا کون ہو گا جو اپنے قتل کے وارنٹ پر دستخط کرے؟
پھر دوسری غلطی یہ ہوئی کہ صدارتی اُمیدوار کے لئے ایک ایسی محترم ہستی کو منتخب کیا گیا جس کے محترم
ہونے میں تو کلام نہیں تھا (نہ ہے) مگر وہ ہستی" کے صدارتی نظام میں صدر کے عہدہ کے لئے اہل ہونے
میں ضرور کلام تھا (اور ہے) حزبِ اختلاف کے مقابلہ میں حزبِ اقتدار اس قسم کے کسی تذبذب یا
حماقت کی شکار نہ تھی۔ لہٰذا میدان اُس کے ہاتھ میں رہا۔

سڑک پر سفر کرتے وقت اگر سڑک پار کرنے کا مرحلہ درپیش ہو تو دائیں بائیں دیکھ کر یکسو ہو کر
شخص چاہے تیزی سے سڑک پار کر سکتا ہے لیکن اگر سڑک عبور کرنے سے قبل وہ فیصلہ نہ کر پائے تو وہ
سڑک عبور نہ کر سکے گا اور اگر وہ سڑک کے بیچوں بیچ تذبذب میں پڑ جائے تو اُس کی جان کی خیر نہیں۔
اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ملک کا صدارتی انتخاب تو سڑک پار کرنے کے مقابلہ میں کہیں اہم ہے البتہ
نتائج کے اعتبار سے سڑک پار کرنے والے کا تذبذب فقط ایک شخص کو لے ڈوبتا ہے مگر صدارتی انتخاب
میں حزبِ اختلاف کا تذبذب ایک تو خود اُسے لے ڈوبتا ہے دوسرے ملک و ملت کی خوش حالی کے
ستارہ کو بھی گہنا دیتا ہے۔

صدارتی نظام قبول کرنیکے فوائد :- "صدارتی نظام کے قبول کر لینے سے ملک کو استحکام تو نصیب ہو گا ہی اور ملت کے سیاسی مزاج کو بھی انتشار سے نجات ملے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود حزب اختلاف کو بھی حسب ذیل فوائد حاصل ہوں گے :-

(ا) صدارتی نظام کے حق میں فیصلہ دینے کا مطلب تذبذب اور دو دلی کا خاتمہ ہوگا اور حزب اختلاف اس نظام کی ضروریات کے تحت اپنی پوری قوتوں کو مجتمع کر کے اور اپنی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر آئندہ انتخابی جدوجہد میں حصہ لے گی۔

(ب) پھر اس فیصلہ سے انہیں اپنی اس کمزوری کا احساس بھی ہو جائے گا کہ گذشتہ سترہ برس میں جمہور پاکستان کے سامنے اپنے پروگرام اور اپنی لیڈر شپ رکھنے کے باوجود وہ جمہور کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ہو سکتا ہے اس سلسلے میں بعض موانعات اور دشواریوں کا ذکر کیا جائے اور بجا طور پہ کیا جائے مگر یہ مانعات اور دشواریاں کم از کم مارچ ۱۹۵۶ء سے اکتوبر ۱۹۵۸ء تک کے اڑھائی برس کے عرصہ میں موجود نہ تھیں۔ کیونکہ اس عرصہ میں سابق آئین کے تحت اہل ملک کو بنیادی حقوق میسر تھے اور ان حقوق کو نافذ کرنے کے لئے عدالتوں کو کامل اختیارات میسر تھے۔ پس اس اڑھائی برس کے عرصہ میں حزب اختلاف کو اس درجہ مضبوط اور مقبول ہونا چاہیئے تھا کہ اگر ملک میں کوئی تبدیلی کسی غلط (غیر جمہوری) راستہ سے آتی تو وہ اس کا راستہ روک سکتی مگر اس حزب اختلاف (جس کی "مضبوطی و مقبولیت" کا یہ عالم تھا کہ اس کے رہنماؤں کے لئے ڈیڑھ ڈیڑھ میل لمبے جلوس نکل رہے تھے) کی یہ حالت ہوئی کہ جب ملک کا آئین کالعدم قرار دیا گیا تو اس سے یہ بھی نہ ہوا کہ احتجاج کے کسی اسلوب کو اپنا سکتی۔ "اقدام" کے م۔ش راوی ہیں کہ انہوں نے احتجاج کی ایک تجویز یہ پیش کی تھی کہ سارے سیاسی رہنما جیلیں بھر دیں مگر انہیں اپنا مؤید ایک بھی نہ ملا ان حالات میں یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ حزب اختلاف کے راہنماؤں کو عوام کا مکمل اعتماد حاصل نہ تھا اور اگر تھا تو یہ سطحی تھا اور اس کی جڑیں عوام کے دلوں میں پیوست نہ تھیں۔

(ج) پھر انہیں اس حقیقت کا احساس بھی ہو جائے گا کہ وہ ایک منفی اور دفاعی قسم کی جدوجہد میں مبتلا ہیں اور ملک کی تعمیر و استحکام کے لئے اُن کے پاس کوئی مثبت پروگرام موجود نہیں اور اُن کا مقصد محض ایک برسر اقتدار حکومت کو بدلنا ہے پس اس اعتبار سے اس جدوجہد کو وہ قوت نصیب

نہیں ہوتی جو ایک مثبت پروگرام پر عمل پیرا جماعت کو پیش قدمی کی قوت دیتی ہے۔

(د) پھر اُنہیں اس امر کا احساس بھی ہوگا کہ متحدہ حزبِ اختلاف کا خمیر جن مختلف عناصر سے ترکیب پایا ہے۔ اُن میں متحد ہونے کے لئے کوئی ایک بنیاد موجود نہیں اور اس کے علاوہ کوئی ایک رہنما بھی اُنہیں ایسا میسّر نہیں جس پر ملک کے دونوں حصّوں میں اعتماد ہو سکے۔ جہاں تک مادرِ ملّت کا تعلق ہے اُن سے عوام نے جذباتی وابستگی تو ضرور ظاہر کی مگر بنیادی جمہوریتوں کے اراکین کی اکثریت نے اُنہیں (بجا طور پر) مملکت کا صدر بننے کا اہل نہ سمجھا۔ متحدہ حزبِ اختلاف نے صدارتی جد و جہد میں افواہیں پھیلانے کا جو نیا حربہ اختیار کیا تھا (اور جو پورس کے ہاتھیوں سے زیادہ مُفید ثابت نہ ہوا) اس کی بنا پر تیس ہزار ووٹر جنھوں نے مادرِ ملّت کو ووٹ دیئے خدا جانے حسنِ نیت کے علاوہ کن کن سبز باغوں سے متاثر کئے گئے تھے اب جب کہ پانسہ پلٹ چکا ہے یہ تیس ہزار تین ہزار بھی رہ جائیں تو غنیمت سمجھنا چاہیئے۔

(ہ) علاوہ بریں اس امر کا احساس بھی ہو جائے گا کہ حزبِ اختلاف کے پاس کوئی ایسی تنظیم نہیں جو اُسے رابطۂ عوام کے سلسلہ میں کام دے سکے۔ حالیہ صدارتی انتخاب میں ایک طرف مادرِ ملّت کے میدانِ سیاست میں آنے سے عام ووٹروں کے ذہن ہموار ہو رہے تھے تو دوسری طرف اُن سے مزید کام لینے کے لئے کوئی تنظیم موجود نہ تھی۔ جذبات کی شدت نے ایک بے سری فوج کو جنم دے دیا اور اس میں زیادہ تعداد ستم رسیدہ اور زخم خوردہ طالب علموں کی تھی۔ پھر جب فی الواقع ووٹ دینے کا وقت آیا تو عام آدمی یہ نہ جانتا تھا کہ کون شخص مادرِ ملّت کی صحیح معنوں میں حمایت کرے گا اور بہت سے ووٹر اس چکر میں یا تو ووٹ کا صحیح یا سرے سے اس کا استعمال ہی نہ کر سکے پھر جب انتخابی ادارہ کے اراکین کا انتخاب ہُوا تو اُن تک پہنچنے کے لئے کوئی معقول بندوبست موجود نہ تھا کہ انہیں حزبِ مخالف کے صدارتی امیدوار کے حق میں ہموار کیا جائے۔

(و) پھر متحدہ حزبِ اختلاف پر یہ حقیقت بھی روشن ہو جائے گی کہ اگرچہ آرام کرسی پر بیٹھ کر سوچی گئی تجاویز، موچی دروازے کے جلسے، دو ورقہ بازی اور دروغ گو پریس اب بھی رائے عامہ کو کسی حد تک متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر اصل مرکز ثقل کہیں اور منتقل ہو چکا ہے۔ یعنی اب اس ملک میں برادریوں وغیرہ کو اصل قوت حاصل ہے اور مختلف سطحوں پر ووٹ حاصل کرنے

کے لئے برادریوں سے رجوع ہی کارگر ثابت ہوتا ہے اور مندرجہ بالا اسلحہ یہاں کوئی کام نہیں کرتے۔

(۳) پھر اس ملک میں نودولتیوں کی ایک کھیپ کی کھیپ موجود ہے جو ووٹ لیتے اور دیتے وقت فقط اپنے مفاد کو نگاہ میں رکھتی ہے اور اس سلسلہ میں ہر برسرِاقتدار جماعت سے سودا بازی کرنے کو ترجیح دیتی ہے بدقسمتی سے اس طبقہ کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

(۴) علاوہ بریں ملک میں سیاسی جماعتوں کے اسی مستحکم نظام کی عدم موجودگی میں "آزاد" امیدواروں کی بن آئی ہے اور سیاست اور سیاسی جماعتوں سے اجتناب کی ایک ذہنی فضا ہموار ہو گئی ہے۔

یہ اور اس طرح کے اور فوائد سے حزبِ اختلاف صرف اسی صورت میں متمتع ہو سکتی ہے اگر وہ صدارتی نظام کو بہ صمیم قلب اختیار کرے لیکن اگر صورت حال یہی رہے کہ پارلیمانی نظام کے نام پر پاکستانیوں کے دماغ میں برسرِاقتدار حکومت کے خلاف باغیانہ جذبات کا لاوا تیار کیا جاتا رہے اور دوسری طرف کسی اصول اور لائحہ عمل پر تکیہ کرنے کے بجائے ایک محترم ہستی کو ایکسپلائیٹ کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حزبِ اختلاف خود انتخابات میں پٹے گی، پھر جب انتخابات کا ہنگامی دور ختم ہو جائے گا اور جمہور کو نارمل حالات میں سوچنے سمجھنے کو موقع ملے گا تو حزبِ اختلاف کے تخریبی رول کی قلعی کھل جائے گی اور اسے مقبولیت سے محروم ہونا پڑے گا۔ پھر اس طرح کے حربوں سے کامیابی نہ پہلے نصیب ہوئی ہے اور نہ اب ہوگی - ہوگا فقط یہ کہ ایک طرف تو ملک میں صحتمند بنیادوں پر حزبِ اختلاف وجود میں نہیں آئے گی برسرِاقتدار قیادت کے خلاف عدم اعتماد کی فضا کو بحال رکھا جائے گا اور ملک کے سیاسی مزاج میں انتشار کی فضا قائم رہے گی تو دوسری طرف حزبِ اختلاف کو بھی یہ کھیل مہنگا پڑے گا اور اس کی اپنی صفوں میں پست ہمتی اور شکست خوردگی عام ہو جائے گی اور اس کے لئے فقط یہی چارہ کار رہ جائے گا کہ درجِ ذیل قسم کی خود فریبیوں سے خود کو مطمئن کرے:۔

"کہا گیا کہ صدارتی انتخاب کا بیلٹ پیپر ایسا ہے کہ اس کے خانہ نمبر چار میں محترمہ فاطمہ جناح کے نام کے سامنے نشان لگانے کا جو خانہ ہے اس میں ایک کیمیاوی مسالہ لگا یا گیا ہے اس میں جب ووٹر نشان لگا کر کاغذ کو تہ کرے گا تو نشان خانہ نمبر ایک (صدر ایوب کا خانہ) میں منتقل ہو جائے گا۔۔۔۔ (سیارہ"۔ اشاعت فروری ۱۹۶۵ء کالم "باتیں" ذیلی عنوان "کواکب")

یہ گویا بے اعتمادی کا واضح کرشمہ تھا"

(باقی صفحہ ۱۸ پر دیکھیں)

انگریزوں کی روایت پرستی

(لندن سے ایک رفیق کا مکتوب)

مخدومی و مکرمی ادام اللہ ظلکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج گرامی!

قبل ازیں ایک عریضہ لکھ چکا ہوں۔ اُمید ہے پہنچا ہوگا۔ پچھلے ہفتہ میثاق کا تازہ شمارہ ملا الحمدللہ کہ آلِ عمران کی تفسیر کی قسط بغیر کسی تاخیر کے شروع ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و قوت اور سکونِ قلب کی فراوانی عطا کرے اور اس مہم کو آپ کے لئے سہل بنا دے۔ اُمید ہے کام باقاعدگی سے جاری ہوگا۔

اس سورہ کی تمہید میں آپ نے ایک فصل[1] حذف کر دی ہے جو تفسیر سورہ بقرہ میں موجود ہے یعنی مضامین کا خلاصہ اور آیات کی تقسیم۔ میری ناچیز رائے میں اگر وہ فصل باقی رکھی جاتی تو بہتر ہوتا اور تفاسیر میں یکسانی بھی پیدا ہوتی۔

تذکرہ و تبصرہ میں آپ نے جن امور پر بحث کی ہے وہ بہت اہم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے پہلے اداریوں کو جانبداری پر محمول کیا تھا وہ بھی اس کو پڑھ کر آپ کی حقیقت پسندانہ رائے کا اعتراف کرلیں گے۔ یہاں پر جن لوگوں سے میرا میل جول ہے ان میں ان لوگوں کو چھوڑ کر جن کے اندر جماعت کی سمیت سرایت کئے ہوئے ہے، عموماً یہی رجحان پایا جاتا ہے کہ مس جناح کی سربراہی واقعی ملک کو مہنگی پڑتی اور ایوب کتنے بُرے سہی مگر ملک کے لئے ان کا وجود بہرحال غنیمت ہے۔ یہاں کے پریس نے بھی ایوب کے کردار کی تعریف کی ہے اور صاف طور پر لکھا کہ الیکشن

---

[1] اصل کتاب میں اس فصل کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ مدیر

کی مہم کے دوران میں اس نے فاطمہ جناح کے بالمقابل زیادہ رواداری اور وسعت نظر کا ثبوت دیا ہے اس سلسلہ میں ڈیلی ٹیلی گراف کا ایک تراشہ بھیج رہا ہوں۔ یہ میرے نزدیک کسی انصاف پسند صحافی کی تحریر ہے اور اس نے بہت گہری نظر سے تمام حالات کا مشاہدہ کیا ہے۔ ہمارے اخباروں میں اس طرح کی تحریروں کے اقتباسات اگرچہ دئے جاتے ہیں تاہم مجھے خیال ہوا کہ آپ کے مطالعہ کے لئے ایک غیر جانبدار رائے کا بھیجنا مناسب رہے گا۔

پچھلے دنوں یہاں کے پارلیمنٹ ہاؤس کی سیر کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس سلسلہ کے بعض مشاہدات آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے کیونکہ ان سے انگریز کی روایت پرستی کے کچھ نمونے آپ کو معلوم ہوں گے اور اس کے علاوہ یہ بات سامنے آئیگی کہ یہ لوگ کس طرح یادگاروں سے اپنی تاریخ کی بعض چیزوں کو محفوظ کرتے ہیں۔

یوں تو لندن میں ہر اہم چوراہے پر مجسمے نصب ہیں اور ان کے ذریعے بعض شخصیتوں اور فوجوں کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے، مگر پارلیمنٹ کے بڑے دروازے پر جو مجسمہ نصب ہے وہ رچرڈ کا ہے جس نے صلیبی جنگوں میں بہت نمایاں کردار ادا کیا تھا اور اب تک اس کو "شیر دل" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جنگی لباس میں گھوڑے پر سوار اپنی تلوار لہرا رہا ہے۔ جرمن کی بمباری کے دوران یہ تلوار ٹیڑھی ہو گئی تھی تو اس وقت چرچل نے کہا تھا کہ "تلوار صرف ٹیڑھی ہوئی ہے، ٹوٹی نہیں"۔ بہرحال اب یہ اپنی پہلی حالت میں ہے۔ پہلے پہل اس ملک میں جب پارلیمنٹ قائم ہوئی تو اس کے اجلاس کے لئے ایک لمبوترا سا ہال کمرہ مخصوص کیا گیا۔ اس کے بعد نئی عمارت بنائی گئی تو محض روایت پرستی کی وجہ سے اس میں بھی بیٹھنے کی جگہیں لمبائی کے رخ پر آمنے سامنے بنائی گئیں۔ حالانکہ آج کل دنیا کے بیشتر ملکوں میں نشستیں نصف دائرے کی شکل میں ہوتی ہیں۔ یہ عمارت ۴۰۰ ارکان کے لئے تھی۔ جرمن کی بمباری کے دوران ایوان زیریں جب بالکل تباہ ہو گیا تو از سر نو جو عمارت تعمیر کروائی گئی وہ ٹھیک سابقہ بنیادوں پر تھی اور اس میں بھی ۴۰۰ ارکان ہی کے بیٹھنے کا انتظام تھا حالانکہ ایوان کے ممبروں کی تعداد ۶۲۵ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ایوان میں انہی ارکان کو بیٹھنے کی جگہ مل سکتی ہے جو خوش قسمتی سے وقت سے پہلے آجاتے ہیں۔ بعد میں آنے والے یا تو دیواروں سے لگ کر کھڑے ہو جاتے ہیں یا پھر فرش پر بیٹھ جاتے ہیں۔

ایوان کی یہ عمارت بالکل نئے سرے سے تعمیر کروائی گئی مگر چرچل کے حکم سے اس کے دروازے کو تبدیل نہیں کیا گیا تاکہ جنگ عظیم کی ایک یادگار محفوظ ہو جائے۔ چنانچہ اب دروازے کے پتھر ٹوٹے ہوئے ہیں اور ان پر دھوئیں کی سیاہی کے اثرات اب تک موجود ہیں۔

ایوان میں وزیراعظم اور لیڈر آف اپوزیشن کی نشست آمنے سامنے ہے۔ درمیان میں صرف ایک بڑی میز رکھی ہے۔ حکومت کے اراکین کو یہ استحقاق حاصل ہے کہ وہ اپنے صوفوں پر بیٹھے ہوئے میز پر اپنے پاؤں رکھ سکتے ہیں۔ کوئی دوسرا رکن ایسا نہیں کر سکتا۔ بظاہر اگرچہ یہ بڑی بدتمیزی کی بات ہے مگر چونکہ روایت ایسی ہی چلی آ رہی ہے اس لئے آج بھی ولسن اور اس کے وزراء اپنے پاؤں میز پر رکھتے ہیں اور یہ میز ایک طرف سے جوتوں کی رگڑ کی وجہ سے گھس رہی ہے۔

انگریزوں کی تاریخ میں ایک بار پارلیمنٹ کو بارود سے اڑا دینے کی سازش کی گئی تھی مگر حکومت کو بروقت اس کا علم ہو گیا اور مجرم کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک جہاں یہ روایت قائم ہے کہ پوری قوم ایک خاص دن مناتی ہے جس میں ویسی ہی کچھ کارروائی ہوتی ہے جو ہندو قوم راون کے بت کے ساتھ کرتی ہے، وہیں یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ کا اجلاس شروع ہونے سے پہلے کچھ سپاہی لالٹینیں لئے ہوئے ایوان کے نیچے ادھر ادھر جھانکتے ہیں اور مجرم کی اس 'تلاش' کے بعد اجلاس کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔

اسی طرح ان کی تاریخ میں ایک بار یہ واقعہ پیش آیا کہ بادشاہ کچھ ارکان پارلیمنٹ سے نالاں تھا اس نے عین اس وقت جب ایوان کا اجلاس ہو رہا تھا کچھ آدمی اپنے ساتھ لئے اور ایوان کے دروازے پر جا پہنچا۔ دروازہ اس وقت بند تھا اس نے اپنے ڈنڈے سے اس کو کھٹکھٹایا سپیکر کے حکم سے کواڑ کی ایک درز میں سے دیکھا گیا تو وہاں بادشاہ موجود تھا۔ سپیکر نکلا تو بادشاہ نے اسے حکم دیا کہ فلاں فلاں ارکان میرے حوالے کرو۔ سپیکر نے گھٹنے ٹیک کر عرض کی کہ حضور میں اس ایوان کا خادم ہوں۔ ارکان کے بارے میں میں اس وقت تک آپ سے کوئی بات کرنے کا مجاز نہیں ہوں جب تک یہ ایوان خود ہی مجھے حکم نہ دے دے۔ ہاں اگر یہ ایوان مجھے حکم دیتا ہے تو میں اس کی تعمیل کروں گا۔ چنانچہ بادشاہ کو بے نیل مرام واپس آنا پڑا۔ اس واقعہ کے بعد ایک طرف تو پابندی عاید کر دی گئی کہ بادشاہ وقت ہرگز ایوان میں داخل ہونے کا مجاز نہیں۔ دوسری طرف ہلال

یہ ڈر اب تک کھیلا جا رہا ہے۔ شاہِ وقت کا ایک ذمہ دار افسر سر سے لے کر پاؤں تک سیاہ لباس میں ملبوس ایوان کے دروازے پر آتا اور اپنے ڈنڈے سے اس کو ٹھونکتا ہے کواڑ میں اب باقاعدہ ایک سوراخ بنا دیا گیا ہے جس میں سے جھانک کر سپیکر یہ دیکھتا ہے کہ اس کے ساتھ سپاہیوں کی کوئی فوج تو نہیں تب اُس کے لئے دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔

ہاؤس آف لارڈز کے صدر کی نشست بہت معمولی سی ہے۔ یعنی اس کے لئے ایک گدا رکھا ہے جس میں اُون بھری ہوئی ہے۔ معلوم ہُوا کہ شروع میں اکابرین کو یہ احساس دلانے کے لئے کہ انگریز قوم کی معاش کا زیادہ تر انحصار اُون کے کاروبار پر ہے ایوان بالا کے صدر نشین کی یہ شکل تجویز کی گئی تھی۔ اب اگرچہ معاشیات کا دارومدار صنعت وغیرہ پر ہے لیکن وہ رسم چھوڑی نہیں گئی۔

اس ایوان کا حجم بھی بہت مختصر ہے۔ اکابرین کی نشستوں کے علاوہ مشکل سے سو سوا سو آدمی ایک طرف کھڑے ہو سکتے ہیں حالانکہ جب ایوان کے اجلاس شروع ہوتے ہیں اور ملکہ افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لئے آتی ہے تو ایوانِ زیریں کے ارکان کو یہ اجازت ہوتی ہے کہ وہ ملکہ کی تقریر سننے کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ اس وقت ایوان کے تین چوتھائی ارکان محض جگہ کی تنگی کے باعث ملکہ کی تقریر نہیں سُن پاتے۔ یہ روایت بھی بڑی تعجب انگیز ہے کہ ملک کا وزیراعظم اس ایوان میں ایک کرسی پانے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ وہ بھی اگر ذرا سی کھڑے ہونے کی جگہ حاصل کرے تو دوسرے ارکان کے ساتھ کھڑا ہو کر کارروائی کو دیکھ سکتا ہے، حالانکہ ملکہ اس موقع پر جو اظہار خیال کرتی ہے اس میں اس کے اپنے فہم و تدبر کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہوتا۔ اس کی تقریر حکومتِ وقت کی لکھی ہوئی اور اسی کی پالیسیوں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

تقریظ و تنقید

اِنسانیّت کا پیغام مشرق و مغرب کے نام

مصنف :۔ مولینا ابوالحسن علی ندوی
ناشر :۔ اسلامک ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز اکیڈیمی ندوۃ العلماء لکھنؤ بھارت
صفحات ۱۸ ، قیمت درج نہیں

مولینا ابوالحسن علی ندوی صاحب کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ کے اسلامی و دعوتی کارناموں کی وجہ سے دنیائے اسلام کے علمی و دینی حلقوں میں آپکو بلند مقام حاصل ہے زیرِ نظر رسالہ درحقیقت آپ کی ایک تقریر ہے جو آپ نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو لندن یونیورسٹی یونین لندن یونیورسٹی اسلامک سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ایک مجلس میں بزبان عربی کی جس کا بعد میں انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔

مولینا موصوف نے اس تقریر میں مشرق و مغرب کے باہمی بُعد کے اسباب بیان کرتے ہوئے صلیبی جنگوں، دورِ حاضر میں مغرب کے سیاسی و معاشی تفوق، مادہ پرستانہ طرزِ فکر اور نسلی برتری کے احساس کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اہل مشرق نے اپنے تہذیبی سرمایہ سے مغرب کو روشناس کرانے کی بجائے اس کی اندھادھند نقالی شروع کر دی، اس سے بھی اہلِ مغرب کو مشرق کی حقیقت سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مستشرقین سے بات کی توقع تھی کہ وہ مشرق کے علمی و تہذیبی ورثہ سے اہل مغرب کو آشنا کر کے اس ان کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے میں مددگار ثابت ہوں گے لیکن چند مستثنیات کو چھوڑ کر بحیثیت مجموعی ان مستشرقین کا طرزِ عمل انتہائی مایوس کن اور متعصبانہ رہا ہے جس کی وجہ سے باہمی قرب کی بجائے ان کا بُعد اور بڑھا ہے۔

تحریک احیائے علوم کے بعد مغرب کی تحقیقات اور علمی و عملی کاوشیں خارجی مظاہر قدرت کی تسخیر پر مرکوز ہو گئیں جس کے نتیجہ میں اہل مغرب کو سائنسی اور حرفتی کمالات حاصل ہوئے لیکن یہ ترقی چونکہ وحی و ہدایتِ خداوندی سے بے نیاز ہو کر حاصل ہوئی اس لئے جلد ہی اسے مادہ پرستی کا گھن لگ گیا جس کی وجہ سے یہ ترقی نوعِ انسانی کے لئے حیات آفرین بننے کی بجائے اس کی تباہی و بربادی اور ہلاکت خیزی کا موجب بن گئی۔

مشرق نے طبعی ماحول سے بڑھ کر انسان کی اصلاح کو اپنی کاوشوں کا مرکز و محور بنایا اور اس کے لئے انسانی عقل و فکر کے گھوڑے دوڑانے کی بجائے وحی الٰہی کو اس کا ذریعہ بنایا۔ مشرق آسمانی ہدایت کا علمبردار اور خدائے عزوجل کے آخری پیغام' اسلام کا امین ہے۔ جب تک مغرب اپنے سائنسی انکشافات اور صنعتی کمالات کو اس آسمانی ہدایت کے نور سے منور نہیں کرتا اس وقت تک اس کے فکر و عمل کی تاریکیاں دُور نہیں ہو سکتیں اور دنیا میں پائدار امن کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ آسمانی ہدایت کی مکمل اور جامع صورت یعنی اسلام ہی عصری علوم و فنون کی ترقیوں کو صحیح معنوں میں نوعِ انسانی کا خدمتگار بنا سکتا ہے ہے۔ عہد حاضر کی تمام تر پیچیدگیاں بنیادی طور پر علم و ایمان کے باہمی بُعد کا نتیجہ ہیں۔ اسلام ہی وہ دینِ ہدایت ہے جس کی بدولت علم و ایمان میں اتحاد اور یگانگت پیدا ہو سکتی ہے۔ اور انسانیت حقیقی مسرت اور کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔

مولانا ابوالحسن علی صاحب نے بڑے تعمق فکر سے عصر حاضر کے اس اساسی مسئلہ کا تجزیہ کیا ہے جو اصحاب نظر کو ایک نئے طرز فکر کی دعوت دیتا ہے۔

ترجمہ کی زبان بڑی رواں اور شستہ ہے۔ (ڈار)

جماعتِ اسلامی کے اندرونی حالات کا ایک عکس

اس شمارے میں ہم مولانا کوثر نیازی کا ایک بیان، امیرِ جماعتِ اسلامی کے نام اُن کا ایک مفصل خط، امیرِ جماعت کی طرف سے اس کا جواب اور کوثر صاحب کا جماعت سے استعفا شائع کر رہے ہیں۔ کوثر صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے پورے سترہ سال ہر طرح کے نرم و گرم حالات میں جماعت کے ساتھ گزارے ہیں، ان کا ہفتہ وار اخبار "شہاب" جماعت کا نہایت سرگرم حامی رہا ہے اور اِدھر ایک عرصے سے خود اُن کا شمار بھی جماعت کے صفِ اوّل کے لیڈروں میں ہوتا رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئینِ میثاق ان تحریروں میں جماعتِ اسلامی کے باطن کا ایک عکس دیکھ سکیں گے اور اس سے ہمارے اُن خیالات کی تصدیق ہو گی جو ہم نے اس جماعت سے متعلق میثاق کے پچھلے چند شماروں میں ظاہر کئے ہیں۔

اس بیان پر تبصرہ اور بعض دوسرے اہم مسائل کا تذکرہ تو ان شاء اللہ آئندہ ہم کریں گے اس وقت صرف اس گزارش پر اکتفا کرنے ہیں کہ کوثر صاحب کے اس بیان کے جس حصے سے ہمیں سب سے زیادہ خوشی ہوئی ہے یہ اس کا وہ حصہ ہے جس میں انھوں نے خود اپنی کمزوری کا بھی نہایت واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے اور تاویل کے پردوں میں چھپنے کے بجائے سچے اعتراف کے ساتھ اپنے آپ کو اپنے خدا کے آگے ڈال دیا ہے۔ ان کی اس اخلاقی و ایمانی زندگی پر ہم ان کو صدقِ دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔ ہم ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے پہلے بھی قدر دان رہے ہیں لیکن ان کی یہ صلاحیت پہلی بار ہمارے سامنے آئی ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں یہ وصف بڑا نایاب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس خوبی کو بڑھائے اور ان کی عمدہ صلاحیتوں سے دین و ملت کو بیش از بیش فائدے پہنچیں۔

(ایڈیٹر)

بیان مولٰنا کوثر نیازی

میں انتہائی غم و اندوہ، سخت قلبی اذیت اور المناک ذہنی کرب کے ساتھ یہ اعلان کر رہا ہوں کہ میں نے جماعت اسلامی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا ہے، اس جماعت کے ساتھ سترہ سال کی طویل مدت تک وابستہ رہنے کے بعد قطع تعلق کا یہ فیصلہ کیوں کرنا پڑا۔ اس سوال کا مختصر سا جواب تو یہ ہے کہ جس منزل تک پہنچنے کی جدوجہد جماعت اسلامی کا اصلی نصب العین تھا وہ منزل نہ صرف یہ کہ نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے بلکہ جماعت کی مرکزی قیادت اسے بدستور غلط راہوں پر چلاتے لئے جانے کی کوشش کر رہی ہے۔

میں کچھ عرصہ سے جماعت اسلامی کے داخلی نظم کی خامیوں، اس کی تباہ کن سیاسی پالیسیوں اور بعض گمراہ کن افکار و نظریات کے بارے میں اپنی بے اطمینانی اور بے چینی کا اظہار جماعت اسلامی پاکستان کے امیر مولٰینا مودودی صاحب سے زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں کرتا رہا ہوں اور میں نے پوری کوشش کی ہے کہ جماعت میں رہتے ہوئے اصلاح احوال کی کوشش کروں مگر افسوس کہ میری یہ ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور بالآخر مجھے بہ تکلیف وہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے کہ میں جماعت سے اپنا تعلق منقطع کر لوں۔

حال ہی میں میں نے مولانا مودودی کے نام ایک مفصل مکتوب لکھا تھا جس میں بڑی دردمندی کے ساتھ اُن اصولی اور عملی خرابیوں کی نشان دہی کی گئی تھی جو جماعت کے موجودہ طریق کار اور اس کی مرکزی قیادت کے طرز فکر و عمل سے رونما ہو رہی ہیں اور انہیں توجہ دلائی تھی کہ ان خرابیوں کے انسداد کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے ورنہ ہماری تنظیم ملک و ملت اور دین و شریعت کی کوئی خدمت انجام دینے کی بجائے اُلٹا ان کی ضرر رسانی کا ذریعہ بن جائے گی، اس سلسلہ میں

ئیں نے پاکستان بھر کے ارکانِ جماعت کا اجتماع بلانے کی تجویز بھی پیش کی تھی مگر مولانا مودودی نے اس مکتوب کے جواب میں جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ حد درجہ افسوسناک اور ان کے آمرانہ مزاج کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

جماعت کی دینی اور جمہوری حالت اس وقت یہ ہے کہ صدارتی انتخاب کے موقع پر پچھلے دنوں جماعت کی مجلس مشاورت نے جو قرارداد پاس کی تھی وہ جیل میں مولانا مودودی نے لکھی تھی اور اسے لفظ بلفظ مجلس مشاورت کا فیصلہ قرار دے کر جمہوریت کا منہ چڑایا گیا تھا۔ جماعت بنیادی جمہوریتوں پر تنقید اور بالغ رائے دہی کا مطالبہ کرتی ہے مگر خود اس نے اپنے نظام میں اس طرح کی درجہ بندی قائم کر رکھی ہے اور ہزاروں کارکنوں میں سے صرف پندرہ سو ارکان کو ووٹ کا حق دیتی ہے۔ جماعت پر تنخواہ دار لیڈر شپ مسلط ہے اس کا ہر پندرھواں رکن تنخواہ دار ہے حد یہ ہے کہ اس کی ہیئتِ حاکمہ مجلس عاملہ تک کے ارکان ایک آدھ کے سوا سب کے سب تنخواہ دار ہیں اور مولانا مودودی انہیں شوریٰ میں سے نامزد کرتے ہیں اگر کوئی رکن جماعت کی پالیسی تبدیل کرنے کے لئے جماعت کے اندر بھی اظہار رائے کرے تو وہ جماعتی دستور کی رُو سے جماعت کا عہدے دار نہیں رہ سکتا۔ سیاسی بے تدبیریوں کا عالم یہ ہے کہ ایک طرف تو واضح اصُولی اور بنیادی اختلافات اور ارکان جماعت کی بے چینی کے باوجود جماعت متحدہ محاذ میں شامل ہو گئی اور دوسری طرف صرف ایک ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے اس نے محاذ میں رہتے ہوئے محاذ کے پارلیمانی بورڈ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

جماعت اسلامی کے بگاڑ کا مسئلہ اگر سیاسی میدان تک ہی محدود رہتا تو ممکن تھا کہ اسے مزید کچھ دیر کے لئے برداشت کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن بدقسمتی سے نوبت اب یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ سیاسی مصلحتوں کے لئے واضح شرعی حرمتوں کو سراسر غلط اور ناجائز طور پر "ابدی" اور "غیر ابدی" حرمتوں میں تقسیم کرنے کی جسارت کی جا رہی ہے اور جماعت کے جبری نظام میں اس کے خلاف آواز اُٹھانے کی گنجائش بھی نہیں چھوڑی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی جو ابتدائی دور میں بلاشبہ ایک بااصول دینی جماعت تھی اب ایک دینی جماعت تو درکنار، ایک بااصول سیاسی پارٹی کے مقام سے بھی گر چکی ہے

اور دینی و اصلاحی معاملات میں اس کی سرگرمیاں بالکل برائے نام رہ گئی ہیں، جماعت کے مخلص کارکنوں کی میرے دل میں اب بھی بے حد قدر ہے اور آئندہ بھی رہے گی، مگر مجھے افسوس ہے کہ کچھ یہ اپنے اندھا دھند اعتماد کی وجہ سے اور کچھ جماعت کے موجودہ آمرانہ نظام کی وجہ سے بالکل بے بس بنا کر رکھ دیئے گئے ہیں اور ان کی طرف سے جماعت کی غلط روش کو تبدیل کرنے کی کوئی کوشش مؤثر نہیں ہو سکتی۔

اس بیان کے ساتھ میں اپنا مفصل مکتوب، اس کے جواب میں مولانا مودودی کا خط اور اپنے استعفیٰ کی نقول بھی پریس کے حوالے کر رہا ہوں، تاکہ اس جماعت سے دلچسپی رکھنے والا باشعور طبقہ خود یہ فیصلہ کر سکے کہ ان حالات میں میرے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ کار باقی رہ گیا تھا کہ میں جماعت سے مستعفی ہو جاؤں۔

کوثر نیازی
۲۱۔ فروری ۱۹۶۵ء

خط

مولانا کوثر نیازی بنام امیر جماعت اسلامی پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم امیر جماعت　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

پچھلے دنوں میں نے ایک تفصیلی ملاقات کے لئے آپ سے حاضر ہونے کی اجازت چاہی تھی، حاضر بھی ہوا مگر آپ خواجہ عبدالحیٰ مرحوم کی فاتحہ خوانی کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، سرسری سی بات ہوئی اور تفصیلات پھر کسی وقت کے لئے ملتوی ہوگئیں، بعد میں مجھے درد گردہ کا دورہ پڑ گیا، اب طبیعت بحال ہے مگر مسلسل نشست رکھوں تو تکلیف ہونے لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ آج تحریری طور پر آپ کو مخاطب کر رہا ہوں۔

متحدہ محاذ میں جماعت کی شمولیت پر میرے خیالات آپ سے اور دوسرے رفقاء سے ڈھکے چھپے نہیں جب ۱۹۶۲ء میں مسٹر سہروردی مرحوم سے آپ نے متحدہ محاذ کے سلسلے میں گفتگو کا آغاز کیا تو میں نے "شہاب" مؤرخہ (۲۱۔ اکتوبر ۶۲ء) میں "مسٹر سہروردی سے چند سوالات" کے زیر عنوان ایک ادارتی شذرہ سپرد قلم کیا تھا مقصود یہی تھا کہ جو لوگ غیر اسلامی نظریات کے علمبردار اور ملک میں جمہوریت کے قائل ہیں جماعت ان کی طرف دست تعاون بڑھانے سے باز رہے۔

اس پر آپ نے ایک ملاقات میں مجھے اس طرح کی تحریریں لکھنے سے منع کر دیا کیونکہ آپ کے نزدیک اس سے جماعت کی پوزیشن خراب ہوتی تھی، میں نے آپ کے اس حکم کی تعمیل کی مگر اس کے ساتھ میں برابر "شہاب" کے ذریعے ایک اسلامی محاذ کی تشکیل پر زور دیتا رہا۔

۱۹۶۴ء میں جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور اس زمانے میں مرکزی دفتر کے باقی ماندہ اصحاب نے محاذ کے قیام کے لئے دوسری پارٹیوں کے ساتھ پھر سے مذاکرات شروع کر دیئے، میرا خیال یہ تھا کہ جماعت موجود نہیں اور یہ اصحاب اپنی ذاتی حیثیت میں محاذ میں شریک ہو رہے ہیں، اس لئے میں نے ۱۶۔ فروری ۱۹۶۴ء کے "شہاب" میں ایک مرتبہ پھر تفصیل سے

اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا اور بدلائل واضح کیا کہ اس طرح کے متضاد اور منصادم عناصر کا اتحاد ملک و ملت، دینی اقدار اور خود جماعت کے لئے سخت تباہ کن ثابت ہوگا۔ اس مضمون کے چھپتے ہی ان رفقاء نے میرے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم تیز تر کردی، کارکنوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ اُنہوں نے یہ سب کچھ جیل سے آئی ہوئی ہدایات کے مطابق کیا ہے اور دوسری طرف یہ دھمکی دے کر میرا مُنہ بند کرنے کی کوشش کی گئی کہ اگر میں اس طرح کے خیالات ظاہر کرنے سے باز نہ آیا تو خلاف قانون قرار دیے جانے کے باوجود جماعت کا جو ڈھانچہ اپنے طور پر اُنہوں نے قائم کر رکھا ہے وُہ پورے ملک کے متعلقین کو جماعت سے میرے نکل جانے کی اطلاع کر دے گا۔

میں پروپیگنڈے کی اس مہم سے متاثر تو نہیں ہوُا (اس لئے کہ میرے خلاف اس طرح کی کئی مہمیں عرصہ سے بعض ممتاز اصحاب کے زیر سایہ جاری تھیں اور میں زبانی اور تحریری طور پر کئی دفعہ آپ کو ان کی اطلاع بھی دے چکا ہوں اور بطور احتجاج اس سلسلے میں اپنے منصب سے استعفیٰ بھی دے چکا ہوں) لیکن اس خیال سے کہ آپ کی عدم موجودگی اور جماعت کی بندش کے باوجود اس طرح کے اختلافات جگ ہنسائی کا باعث بنیں گے اور اس سے ہمارے سادہ دِل کارکنوں کو بہت صدمہ ہوگا، میں خاموش ہوگیا تا آنکہ جماعت نے صدارتی انتخاب میں اپنے سابق موقف کو چھوڑ کر محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کو دینِ اسلام کا تقاضا اور جہاد قرار دے دیا، آپ باہر تشریف لے آئے اور جماعت کی پُوری طاقت کو آپ نے اس انتخابی مہم میں جھونک دیا۔ یہ مرحلہ بظاہر اب ختم ہو چکا ہے مگر اس کے خطرناک نتائج و عواقب کارکنانِ جماعت میں بڑھتی ہوئی مایوسی، اضمحلال اور جمود کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ جماعت جس غلط راستے پر چل پڑی ہے بلکہ اس راستے کی جس منزل پر جاکر رُک گئی ہے اس کی مثال ایک تنگ گلی کی سی ہے جس سے پیچھے ہٹنے یا آگے بڑھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔ دُوسرے لفظوں میں ہماری تحریک "رہرواں پشت بمنزل" کا قافلہ بن چکی ہے۔ کتمان حق ہوگا اگر میں جماعتی خیر خواہی کے لئے آپ کے سامنے اپنے قلبی احساسات کی یہ تصویر نہ رکھوں کہ جن تصوّرات کے تحت میں جماعت میں شامل ہوا تھا وہ تصوّرات نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور اپنی ذاتی اصلاح و تکمیل کا جو مقصد مجھے جماعت میں لایا تھا جماعت کی پالیسی اور طرزِ عمل نے دوسرے بہت سے ارکان کی طرح مجھے اس مقصد

ہم ہی نہیں کیا بہت دور پھینک دیا ہے۔

صدارتی انتخاب کی مہم کے دوران جو غلطیاں ہم سب نے کی ہیں وہ اتنی ہولناک ہیں کہ ان
تذکرے سے بھی دل کانپتا ہے اور چونکہ جماعت کی پالیسی کے تحت مجھے بھی ان غلطیوں کا بار بار
کاب کرنا پڑا ہے اس لئے میں ان کی شدت کو بہت زیادہ محسوس کر رہا ہوں مجلس عاملہ کے حالیہ
اس میں اگر اپنی غلطیوں کا احساس و اعتراف کر کے راست روی اختیار کر لی جاتی تو شاید
احساس میں کمی واقع ہو جاتی مگر عاملہ نے اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی ہے میں اس پر مسلسل
ر خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس سے جماعت ایک ایسے راستے پر ڈال دی گئی ہے جو
اعتبار سے سخت دو غلے پن بلکہ (مجھے اس سخت لفظ کے استعمال کے لئے معاف فرمائیے)
اق کا راستہ ہے اور سیاسی حیثیت سے فہم و فراست اور حکمت و دانش کے پہلو سے ہمارے
الیہ ہو جانے کا اعلان عام ہے۔ اس قرارداد کا تضاد خلق خدا کے ساتھ ساتھ مضطرب ارکان
کارکنوں کو مغالطے میں ڈالنے کی ایک دردناک مثال پیش کرتا ہے۔

اس قرارداد کے ایک حصہ میں تو کھلم کھلا اعتراف کیا گیا ہے کہ ۔

"یہ اخلاقی حالت اگر ہماری قوم کی نہ ہوتی تو انتخابات کے یہ نتائج ہرگز ہرگز برآمد نہ ہو سکتے تھے۔ یہ صورت حال اس امر کی ضرورت کو بالکل واضح کر دیتی ہے کہ خود جمہوریت کی بحالی کے لئے بھی قوم کی اخلاقی اصلاح ناگزیر ہے جب تک ہم طبقات کے اخلاق کو پختہ بنیادوں پر استوار کرنے کی فکر اور کوشش نہ کریں گے اس وقت تک دھن دھونس اور دھاندلیوں کے ذریعے سے آمروں کے مسلط ہونے کا دروازہ بند نہ ہو سکے گا۔"

راس کے دوسرے حصوں میں یہ کہہ کر مغالطہ دہی کی حد کر دی گئی ہے کہ ۔

"گذشتہ تین ماہ میں قوم جس آزمائش سے گذری ہے اس سے اس کا یہ احساس بالکل واضح ہو گیا ہے کہ وہ اب بیدار ہے اور اپنے حقوق کے لئے ہر ممکن جدوجہد کا داعیہ رکھتی ہے۔"

اس کے ساتھ دوسرے فیصلوں میں اس امر کا بھی واشگاف الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے کہ ۔

"جماعت اسلامی متحدہ محاذ کا بدستور ساتھ دیتی رہے گی۔"

ان قراردادوں کا جو مطلب میں سمجھا ہوں اور جو میرے خیال میں ہر پڑھا لکھا آدمی سمجھے گا یہ ہے کہ جماعت اپنے ارکان کے اندر پیدا شدہ بے چینی کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں دبا دینا چاہتی ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے بھی سامانِ تسکین موجود ہے جو اصلاح معاشرہ کے طویل اور کٹھن کام کو "مجذوب کی بڑ" سمجھتے اور اس لادینی سیاست کے چکر میں الجھ کر متحدہ محاذ کا ساتھ دینا چاہتے ہیں اور اس میں ان لوگوں کے ذوق کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جو انقلابِ قیادت کے لئے خود معاشرہ کی اصلاح کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس طرح کے دو متصادم نظریات کو ایک ہی سانس میں دہرا دینے کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ جماعت کی قیادت اب بھی اپنے ارکان اور کارکنوں سے صفائی کے ساتھ بات نہیں کرنا چاہتی اور اسے اپنی سابقہ غلطیوں کا اعتراف کرنے میں شدید تامل ہے۔

محترم مولینا! اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ دوسری بہت سی اصولی غلطیوں کے علاوہ ہم نے عورت کی صدارت کے مسئلہ میں جو روش اختیار کی اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی جو سزا ملے گی اس کا مسئلہ تو الگ ہے، اس دنیا میں بھی اندرون و بیرونِ ملک ہماری دینی حیثیت ختم ہو چکی ہے اگر ہمیں صدر ایوب کی مخالفت کرنی ہی تھی اور محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دینا ہی تھا تو سیاسی اور جمہوری ضرورتوں کا اظہار کر کے ایسا کیا جا سکتا تھا مگر اس کے لئے ہم نے غریب اسلام پر جو نوازش کی ہے اور حرمتوں کی ابدی اور غیر ابدی تقسیم کا جو نیا نظریہ پیش کیا ہے اس کے بعد دینی حلقے تو ایک طرف رہے دوسرے غیر جانبدار عناصر حتیٰ کہ اپوزیشن تک کے بعض نمایاں افراد ہمیں ابن الوقت اور سیاست کی خاطر دین میں ترمیم و تحریف کرنے والا گروہ تصور کرنے لگے ہیں۔ آپ عالمِ اسلام کی صفِ اوّل کے ممتاز عالمِ دین ہیں اور میں ایک معمولی طالب علم میں نے کچھ سیکھا بھی ہے تو آپ کے طفیل، لیکن اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ حرمتوں میں ابدی اور غیر ابدی کی یہ تقسیم مان لینے کے بعد ہمارا موقف منکرین حدیث کے گمراہ کن نظریہ سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ منکرین حدیث کا نظریہ یہی تو ہے کہ وہ فقط قرآن میں بیان کردہ حرمتوں کو ابدی مانتے ہیں، حدیث کی حرمتیں ان کے نزدیک غیر ابدی ہیں مگر ہم یہ کہہ کر ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ جاتے ہیں کہ نہیں ساری حرمتیں قرآن کی بھی ابدی نہیں، حرمتیں قرآن کی ہوں یا حدیث کی سب

کی سب ابدی اور غیر ابدی کے خانوں میں تقسیم ہیں۔

محترم مولینا یقین فرمایئے کہ اس نظریہ کی تاویل میں اب تک آپ نے یا دوسرے حضرات نے جو کچھ لکھا یا کہا ہے وہ میری نظر میں ہے (اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جماعتی پالیسی کی جبریت کے تحت میں خود آپ کے اس نئے نظریہ کا دفاع کرنے والوں میں شامل رہا ہوں) مگر اس کے باوجود اس نظریہ کی صحت مجھ پر واضح نہیں ہوسکی اور آج جبکہ یہ سطور لکھتے وقت میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے میں آپ کا بدترین بدخواہ ہوتا اگر اس مہلک نظریہ کے متعلق میں اپنے دل کی بات آپ کے سامنے بیان نہ کرتا قرآن اور حدیث میں حرمتوں کے متعلق "اہون" اور "غیر اہون" کا تصوّر ضرور پایا جاتا ہے مگر "ابدی" اور "غیر ابدی" کا نہیں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ دروازہ کھول کر ہم نے تجدد پسندوں کو دین کی پامالی کا اذن عام دے دیا ہے۔ غیر ابدی حرمتوں کی لکھی لکھائی فہرست تو کہیں درج نہیں۔ ہوگا یہی کہ جو شخص یا گروہ اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کے تحت چاہے گا کسی حرمت کو غیر ابدی ٹھہرا لے گا آخر کسی حرمت کو غیر ابدی ٹھہرانے کا حق ہمیں ہی تو ارزانی نہیں ہوا، دوسرے بھی تو اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم یہ تو کہہ سکیں گے کہ جن ضرورتوں اور مصلحتوں کی خاطر تم ایک حرمت کو جائز قرار دے رہے ہو یہ ضرورتیں اور مصلحتیں معتبر نہیں مگر اس کا کیا جواب ہوگا جب پلٹ کر کسی نے یہ کہہ دیا کہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے آپ کے نزدیک یہ مصلحتیں غیر معتبر ہیں ہمارے نزدیک معتبر اور جہاں تک نظریہ کا سوال ہے وہ خود آپ ہی کا عطا کردہ ہے اس لئے ہم نے اپنے غلط اجتہاد پر عمل کرتے ہوئے بھی۔

"سو حرمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا۔"

تو ہم اس لئے ثواب کے اُمیدوار ہیں کیونکہ مجتہد کے نامۂ اعمال میں غلط اجتہاد پر بھی نیکی لکھی جاتی ہے۔ مجھے اس سے پیشتر آپ کے نظریۂ حکمتِ عملی کے ان خطرناک پہلوؤں کا اندازہ نہ تھا جماعت سے نکلنے والے بعض اکابر اس پر گرفت کرتے تھے تو میں اسے مخالفت اور تعصب پر محمول کرتا تھا مگر صدارتی انتخاب میں پیش ہونے والے اس نئے نظریہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور میں یہاں تک سوچنے لگا ہوں کہ کیا آپ کا پہلا نظریۂ حکمت عملی انہی مضمرات کا

حائل تو نہ تھا؟

میں آپ کے سامنے انتہائی ندامت کے ساتھ خود اپنے بارے میں بھی یہ اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے حقیر سے علم اور مطالعہ کی بناء پر میری رائے یہی تھی کہ موجودہ سیاسی اور جمہوری روایات کی بات تو دوسری ہے لیکن شرعاً عورت کسی بھی صورت میں صدر مملکت نہیں بنائی جا سکتی اور اس کا تو میں کوئی تصور اپنے ذہن میں نہیں رکھتا تھا کہ کبھی ہم بھی اسلام کے نام پر ایک خاتون کی حمایت میں ایسی تحریک چلا سکتے ہیں چنانچہ میں نے اپنی مسجد میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے سینکڑوں افراد کے سامنے قرآن وحدیث کے دلائل سے اپنے اس عقیدے کی وضاحت کی اور بعد میں بعض اخباری نمائندوں کی خواہش پر اس خطبہ کا خلاصہ اخبارات کو بھی بھجوا دیا مگر اسی دوران مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ جماعت اس سے الگ نقطۂ نظر پر سوچ رہی ہے اور امکان غالب اس کا ہے کہ مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا جائے گا میں اس انکشاف پر سراسیمگی کا شکار ہو کر رہ گیا اور جماعت کے فیصلے کے انتظار میں اس بیان کو واپس لے لیا۔

مجھے بعد میں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے جیل سے مرکز جماعت کو یہ ہدایت بھجوائی ہے کہ اس مسئلہ پر ہرگز متحدہ حزب اختلاف کا ساتھ نہ دیا جائے آپ کی گذشتہ تحریروں کی روشنی میں اُمید بھی اس بات کی تھی لیکن جب مجلس مشاورت میں جیل سے آئی ہوئی آپ کی وہ تحریر پڑھ کر سنائی گئی (جسے بعد ازاں لفظ بلفظ مجلس مشاورت کی قرارداد کی صورت میں اخبارات کو ارسال کر دیا گیا) تو میرے حسن ظن کو انتہائی ٹھیس پہنچی شاید آپ کو معلوم نہ ہو میں یہاں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ مجلس مشاورت کے جس اجلاس میں محترمہ کی حمایت کا فیصلہ کرتے ہوئے اس قرارداد کو منظور کیا گیا میں اس میں اپنی غلط فہمی (یا وقت کے بارے میں غلط اطلاع ؟) کی وجہ سے شریک نہ ہو سکا جب میں پہنچا تو یہ قرارداد اخبارات کو بھجوائی جا چکی تھی۔ کاش! میں اس وقت موجود ہوتا اور اس غلط نظریہ پر اہل مجلس کو متنبہ کر کے کم سے کم قرارداد کے الفاظ تو تبدیل کرا دیتا۔ ظاہر ہے اس کے بعد "تیر از کمان رفت،، والا معاملہ تھا اب جماعتی دستور کی رو سے میں اس فیصلہ کی تائید پر مجبور تھا اور جس رائے کو میں دلائل کی بناء پر مرجوح بلکہ غلط سمجھتا تھا اب صرف اس لئے کہ وہ بطور قرارداد منظور ہو چکی ہے جماعت اور مجلس مشاورت کا رکن ہونے کی وجہ سے میں

تحریر و تقریر کے ذریعے اس کی تائید و توثیق کرنے لگا۔

مولینا! میں بہت گنہگار ہوں مگر میری پوری زندگی کے گناہ ایک طرف اور یہ اکیلا گناہ دوسری طرف کہ میں نے جس بات کو شرعاً درست نہیں سمجھا تھا صرف جماعتی قواعد و ضوابط کی وجہ سے اس معصیت پر مجبور ہوگیا کہ اب اس کی نمائندگی کروں! اللہ میرے اس جرم کو معاف فرمائے ورنہ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس جرم کی وجہ سے میرا دل رہے سہے ایمان ہی سے محروم نہ ہو جائے،

نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ،

مولینا! میری رائے یہ ہے کہ اب ہماری یہ محبوب جماعتِ اسلامی ایک عجیب و غریب صورتِ حال سے دوچار ہے:۔

۱۔ اس جماعت کی ابتدا کے وقت نظامِ حکومت کی اصلاح کا جو تصور آپ نے پیش کیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ افراد میں ایمان و اسلام اور احسان کا صحیح شعور پیدا کر کے انہیں انفرادی زندگی میں متقی بنایا جائے اور ان افراد کے ذاتی عمل اور شہادتِ حق کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کی جائے۔ اس طریقے سے نظامِ حکومت کی اصلاح آپ سے آپ یوں ہوگی جیسے سنگترے کے بیج سے سنگترے کا درخت اور پھر اس درخت سے سنگترے کا پھل پیدا ہوتا ہے، اس طبعی عمل کے طور پر اسلامی حکومت اسی اصلاح یافتہ معاشرے سے ظہور پذیر ہوگی۔ یہ تصور اگر جماعت کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا تو کسی اہم مرحلے پر اسے اجاگر کرنے کے بعد پھر سے زیرِ عمل لایا جا سکتا ہے لیکن دوسرے بہت سے اصحابِ قلم کے علاوہ خود آپ نے پچھلے آٹھ، دس برس میں جماعت کو جو فکری غذا دی ہے اور جس طرح پہلے، دوسرے اور تیسرے مرحلے کا تصور دے کر جماعت کے کارکنوں کو یہ باور کرایا ہے کہ جماعت جو بھی پالیسی اختیار کر رہی ہے، وہ اسی تصورِ اقامتِ دین ہی کا نتیجہ ہے جو آپ نے شروع میں پیش فرمایا تھا، اس کے بعد جماعت کے کارکنوں کو پھر سے اصلاحِ ذات اور اصلاحِ معاشرہ کے کاموں پر لگا دینے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

مزید برآں ہم نے پچھلے چند سالوں میں بالعموم اور صدارتی انتخاب میں بالخصوص جس قسم کی اپوزیشن کا کردار ادا کیا ہے ارباب اقتدار کو اپنا حریف بنایا اور خود جس طرح ان کے حریف بنے ہیں اس کے بعد داعیِ دین کے حیثیت سے ہمارے لئے ملک میں کام کرنے کی کوئی صورت موجود نہیں۔ اس پہلو

سے میری مایوسی اس وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ ہم نے ۴۹ء کی انتخابی پالیسی سے لیکر عورت کے مسئلہ صدارت تک ہر متضاد بات کے لئے جس طرح نصوص قرآن وحدیث کو پیش کیا ہے اس کے بعد اس ملک میں کوئی ذی فہم آدمی ہماری پیش کردہ دینی اور اصلاحی دعوت پر اعتماد نہیں کرسکتا تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، تضادات کا شکار ہوتے جانے کے سارے ادوار آپ سے بڑھ کر کس پر روشن ہوں گے۔ پہلے ہم نے امیدواری کو حرام قرار دیا۔ اس کے لئے صحابہ تک کی کسی جلیل القدر شخصیت میں امیدواری کا کوئی پہلو ہمارے سامنے پیش کیا گیا تو ہم نے اپنی اجتہادی رائے کو نص کا درجہ دے کر اس پر تنقید کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا مگر اب ہم اپوزیشن کے ساتھ مل کر امیدواروں سے خود درخواستیں طلب کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ صالح نمایندہ پنچایتی سسٹم سے آئے جس جماعت یا گروہ سے بھی تعلق رکھتا ہو، پھر ہم نے صالح نمائندوں کو جماعت کے دائرے میں مخصوص کر دیا۔ پہلے ہم پارٹی ٹکٹ کو لعنت کہتے تھے، اب محاذ کے ساتھ شریک ہوکر "غیر صالحین" کو بھی ٹکٹ بانٹ رہے ہیں۔ ہم نوٹ پر قائداعظم کی تصویر چھاپنے پر سخت برہم تھے صدارتی انتخاب میں ہمارے کارکنوں نے ان کی بہن کے تصویریں وہ چہرہ گلی گلی فروخت کئے۔ پہلے ہم نے صدارتی سے بھی بڑھ کر امارتی تصور خلافت پیش کیا تھا، اب ہم پارلیمانی نظام جمہوریت کو اسلامی قرار دیتے ہیں۔ پہلے ہم اسمبلیوں میں اراکین کی الگ پارٹیاں بنانے کو غیر اسلامی قرار دیتے تھے بعد میں ہم نے خود اس پر عمل کیا۔ پہلے ہم مخلوط جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے، اب مخلوط جلسوں کی صدارت کرتے اور ان میں تقریریں کرتے ہیں۔ پہلے ہم علماء کے اتحاد کی کوشش کرتے اور موجودہ پارٹیوں کو ساتھ ملانا غلط سمجھتے تھے، اب علماء کے اتحاد سے بے نیاز اور سیاسی پارٹیوں کے محاذ کو مضبوط کرنا تقاضائے اسلام سمجھتے ہیں۔ پہلے ہم خواتین کو ووٹ کا حق دینے میں راضی نہ تھے اب ان کی صدارت تک کے لئے کوشش کرتے ہیں پہلے ہم اپوا کے زبردست ناقد تھے اب انہی کا ایک حصہ متحدہ حزب اختلاف کی خواتین کمیٹی کی صورت میں منظم ہوتا ہے تو ہمارے اکابرین کی بیگمات ان کے جلسوں سے خطاب فرماتی ہیں پہلے ہم طلباء کو عملی سیاست میں حصہ لینے سے روکتے تھے اب ان سے عملی سیاست میں شریک ہونے کی اپیلیں کرتے ہیں پہلے ہم جلسوں اور نعروں کو غیر اسلامی کہتے تھے اب غلافِ کعبہ تک کے جلوس نکالتے اور اپنے رہنماؤں

یے لئے زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔ پہلے ہم ان انسانی (غیراسلامی) قوانین پر چلنے والی عدالتوں میں
مقدمات لے جانا بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے اب انہی عدالتوں کو ہم عدل و انصاف کا محافظ قرار دیتے
ہیں پہلے ہم وکیلوں کو شیطانی برادری کا رکن سمجھتے تھے اب انہی کو جمہوریت کا سرپرست کہتے ہیں۔
یں یہ عرض نہیں کرنا چاہتا کہ ہماری ان باتوں سے کون سی بات صحیح تھی اور کون سی غلط، یہ تو مشتے
نمونہ از خروارے ہے اور یقین مانئے انتہائی دکھ کے ساتھ میں نے جماعتی تاریخ کی طرف یہ اشارے
لئے ہیں عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنے واضح تضادات کو وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ
م اسلامی اور دینی سمجھ کر چھوڑتے اور اختیار کرتے رہے ہیں تو اب "ترک و اختیار" کے ان مظاہروں کے
بد اپنے ارکان کے سوا، کون ہمارے دینی فکر پر بھروسہ کرے گا؟

۲۔ اگر ہم دین کے لئے کوئی کام نہ کر سکتے تو ہمارے لئے ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے کام
رنے کا دوسرا میدان باقی تھا مگر میں نہایت افسوس کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ ہماری تنظیم
کے قواعد اور اس کی موجودہ ہیئت اس کے لئے سخت غیر موزوں اور نامناسب ہے۔ ہمارے نظام
یں محدود رکنیت کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کی وجہ سے ہمارے ارکان کی تعداد غالباً ابھی تک
ڈیڑھ ہزار سے متجاوز نہیں ہو سکی۔ اس میں بھی ہر پندرھواں رکن تنخواہ دار ہمہ وقتی کارکن ہے۔
ماعت کے پورے دروبست اور قیادت پر انہی ہمہ وقتی اصحاب کا قبضہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ
ن میں انتہائی مخلص لوگ شامل ہیں لیکن جیسا کہ آپ کی طرف سے قیم حلقہ ہونے کی بالا صرار دعوت
پر میں نے عرض کیا تھا کہ ہمہ وقتی ہونے کے بعد تنخواہ اور معاوضہ کی شرح سے کام کی پیمائش ہوتی ہے،
س کے لئے غریب کارکنوں کو اپنے دفاع میں بہت کارگزاری بیان کرنا پڑتی ہے، معترض ارکان کا
جواب دینے کے لئے حامی ارکان ڈھونڈنے پڑتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بے لوث تنخواہ دار قیادت
بھی سازشوں اور گروپ بندیوں کا شکار ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں معیار بدقسمتی سے یہ نہیں کہ کون اہل ہے
جسے اعزازی طور پر ہی سہی جماعت کی قیادت سونپ دی جائے۔ معیار یہ ہے کہ کون فارغ یا
معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہے جسے ہمہ وقتی بنا کر قائد بنا دیا جائے۔ آپ ناراض نہ ہوں تو عرض
کروں کہ آج جماعت کی ہیئت حاکمہ مجلس عاملہ تک میں ایک آدھ رکن کو چھوڑ کر باقی سب حضرات
یہی تنخواہ پانے والے ہمہ وقتی رفقاء ہیں ان کی سیرتیں بہت بلند سہی مگر ظاہر ہے جماعت سے

معاشی وابستگی کے بعد وہ پورے زور اور جرأت سے اختلاف رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں تو یہ بات اور مشکل ہو جاتی ہے جبکہ ہمارے دستور (بمطابق قرار داد ماچھی گوٹھ) کی رو سے وہ شخص جماعت کے کسی منصب پر فائز ہو ہی نہیں سکتا جو کبھی جماعت کی طے شدہ پالیسی سے اختلاف رائے کا اظہار کر چکا ہو (خواہ یہ اظہارِ اختلاف خود آپ کے سامنے ہی کیوں نہ ہو)۔

پھر رائے دہندگی کے معاملہ میں بھی ہم نے لینے اور دینے کے باٹ الگ الگ بنا رکھے ہیں ہم پورے ملک میں تو بالغ رائے دہی چاہتے اور بنیادی جمہوریتوں کے نظام پر سخت سے سخت تنقید کرتے اور حقوق کے معاملہ میں درجہ بندیوں کو از روئے اسلام ظلم عظیم سمجھتے ہیں مگر خود اندرونِ جماعت ہمارا رویہ یہ ہے کہ ہم نے اس میں متاثر، ہمدرد، متفق اور رکن کی درجہ بندیاں قائم کر رکھی ہیں اور جماعت کے عہدہ داروں وغیرہ کے انتخاب میں ان کارکنوں کو بھی ووٹ دینے کا حق نہیں دیتے جو سالہا سال سے نہایت اخلاص اور ایثار کے ساتھ جماعت کی خدمت بجا لا رہے ہیں جو اس کی مالی امداد کرتے، اس کے جلسوں میں دریاں بچھاتے، اس کی وجہ سے ملازمتوں سے ہاتھ دھوتے اور زمانہ بھر کی مخالفتوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ووٹ کا حق ہمارے ہاں صرف رکن کو ہے متاثر، ہمدرد، کارکن اور متفق اس سے محروم ہیں، البتہ ارکان کے ووٹوں سے بنے ہوئے نظم کی سمع و طاعت از روئے اسلام ان کا فرض ہے۔ جماعت کی بنیادی پالیسیاں ارکان کے اجتماع کی بجائے مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ میں طے ہوتی ہیں اور اب تو ایک عرصہ سے (بالخصوص ۵۷ء میں جماعتی دستور کی ترامیم کے بعد) شوریٰ کو بھی کم ہی زحمت دی جاتی ہے۔ فیصلے کرنے کے لئے سارا دارومدار آپ کی کیبنٹ یعنی عاملہ پر ہے۔ جو فیصلہ یہ کر دے ان سے کوئی رکن اختلاف کرے تو جماعت اسے باہر کا راستہ دکھا دیتی ہے۔

یہی صورت ہمارے ہاں قیادت و امارت کی ہے ۱۹۴۱ء سے لیکر اب تک ہمارے ہاں کوئی ایک فرد بھی جماعتی تربیت سے ایسا تیار نہیں ہوا جو آپ کے بعد (اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر سلامت رکھے) جماعت کی قیادت کر سکتا ہو یا جو جماعت کے اندر اور باہر اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے نمایاں اور ممتاز ہو۔ جس جماعت کی جمہوری اور عددی صورت حال یہ ہو، جس کی قیادت اوّل تا آخر تنخواہ دار ہو، جس میں اظہار رائے پر قدغن ہو جس میں مٹھی بھر لوگ ووٹ کا حق رکھتے ہوں جہاں

ہیں آپ کی پیش کردہ علمی اور دینی آراء سے اختلاف کرنا جماعت کی مخالفت کرنے کے مترادف ہو اس میں ایسا آدمی کیسے داخل ہو سکتا ہے جو خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو ایسا شخص تفصیلات معلوم کئے بغیر شامل بھی ہو جائے تو وہ یہاں پنپ نہیں سکے گا آپ کی تو پورے عالم کی وسیع سیاسیات پر نظر ہے آپ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ جس جماعت میں فقط وہی لوگ چل سکتے ہوں جو آمنا صدقنا اور احسنت و مرحبا کی صدا بلند کرنے ہی کو سعادت سمجھیں وہ جماعت کبھی ایک زندہ قوم کی راہنمائی نہیں کر سکتی۔

۳۔ تیسری صورت یہ تھی کہ ہم سیاست اور اصلاح و تزکیہ دونوں اہم کاموں سے دستکش ہو کر رفاہ عامہ کا منصوبہ بناتے اور خدمت خلق کے لئے کام شروع کر دیتے۔ مگر سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ و مشاہدہ سے نظر یہ آتا ہے کہ ہم اس میدان کے بھی مرد نہیں ہم نے اپنے کارکنوں کو (الا ماشاء اللہ) جو ذہن دیا ہے وہ یہ ہے کہ خدمتِ خلق کا کام سیاسی نتائج حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔ ہم نے ہمیشہ اپنے شفاخانوں اور خدمتِ خلق کے دوسرے کاموں کو جماعت کے اثر و رسوخ اور سیاسی مواقع کے حصول کے پیمانے سے ناپا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی سیاسی اور ہنگامی مقصد کے بغیر ہم خدمتِ خلق کا کوئی بھی منصوبہ زیر عمل نہیں لا سکتے۔

محترم امیر جماعت! یہ تینوں صورتیں ممکن تھیں مگر میں ان تینوں کا دروازہ جماعت کے لئے بند پاتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ جماعت کی اخلاقی حالت (میں اپنے آپ کو مستثنیٰ قرار نہیں دوں گا) انتہائی حد تک زوال پذیر ہو چکی ہے اور اس پہلو سے حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں، تو میری مایوسی اور شدید ہو جاتی ہے میں نے اس سلسلے میں کئی مرتبہ آپ کو توجہ دلائی ہے اور مجھے یاد ہے ہر بار آپ دل گرفتہ ہو کر سر تھام کر بیٹھ جاتے تھے اور اعتراف کر لیتے تھے کہ یہ سب کچھ آپ کو معلوم ہے مگر آپ کچھ نہیں کر سکتے ۲۱۔ اکتوبر ۶۳ء کو اپنے منصب سے مستعفی ہوتے وقت میں نے تحریری طور پر عرض کیا تھا کہ

> "میں عرصے سے دیکھ رہا ہوں کہ احیائے دین کا کام کرنے کے لئے جو کم سے کم ضروری صفات ہم میں ہونی چاہئیں، ہماری عملی زندگی ان کی شہادت نہیں دیتی۔ جماعت کے دروبست

پر فائض بھاری بھاری مشاہرے لینے والے ہمارے بعض راہنما ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے، الزامات عائد کرنے اور چغلی اور غیبت کرنے میں مشغول رہتے ہیں بعضوں کی بول چال تک آپس میں بند ہے یہ ایک دوسرے پر جماعت کے اندر گروپ بندی تک کے الزامات لگاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ "گیلانی برادران" اور "کراچی گروپ" وغیرہ کی افسوسناک اصطلاحیں آپ کے کانوں کے لئے بھی اجنبی نہیں ہوں گی۔ اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کیا جاتا۔ ہاں میں ہاں ملانے والے، علمِ دین سے کورے اور عربی زبان سے بالکل نابلد افراد کو جماعت کی صفِ اوّل میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تقویٰ، علمِ دین اور دوسرے خصائص ہماری نگاہ میں ثانوی بنتے جا رہے ہیں اب "نائب امیر" کے منصب کے لئے بھی ہماری نگاہ جاتی ہے تو چودھری غلام محمد صاحب جیسے رفیق پر جاتی ہے جو بیچارے علمِ دین تو بڑی بات ہے اردو کے چند فقرے بھی صحیح نہیں بول سکتے ہیں چونکہ ایسے لوگوں کی سربراہی سے اختلاف کرنے کا قصوروار ہوں، ان خرابیوں کا ناقد ہوں، چودھری صاحب کی شائع کردہ ایک کتاب "فقہ السنۃ" پر بےلاگ تبصرہ کر چکا ہوں اس لئے مجھے اس جرم کی سزا مرکزی شوریٰ کے ہر اجلاس پر بھگتنی پڑتی ہے۔ جگہ جگہ میرے بارے میں نجویٰ کیا جاتا ہے جس کی صفائی پیش کرتے کرتے اب قریب قریب عاجز آ چکا ہوں۔ یہ صورتِ حال، جو یقیناً آپ سے بھی مخفی نہیں سخت افسوسناک ہے۔ ہماری تنظیم میں یہ رجحانات ہمارے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور اس وقت ملک میں لوگ اگر ہمارے باہمی تعاون اور تعلقات کے مدّاح ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ دوسری جماعتوں کی طرح ہمارے اندرونی حالات

خوش قسمتی سے اخبارات میں شائع نہیں ہوتے۔

اندریں حالات میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں جماعت میں اپنے منصب اور ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں، جماعت کے جلسہ ہائے عام سے خطاب نہ کروں، ایک معمولی رکن کی حیثیت سے خدمت انجام دیتا رہوں تاکہ جماعت میں جو لوگ اپنی بیش قیمت صلاحیتیں خواہ مخواہ مجھے بدنام کرنے میں صرف کرتے رہتے ہیں ان کے لئے تسکینِ دل کا سامان فراہم ہو سکے۔"

یہ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۳ء کی تحریر ہے۔ آج تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ان خرابیوں میں اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں ہوئی۔ باہمی عداوتیں ترقی پر ہیں۔ لین دین کے معاملات میں کارکن تو ایک طرف رہے ہمارے راہنما تک افسوسناک کردار رکھتے ہیں۔ امانتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ عشر اور زکوٰۃ کی رقوم خالص سیاسی اور انتخابی مہمات اور ہمہ وقتی کارکنوں کی تنخواہوں پر صرف کی جا رہی ہیں۔ رائج الوقت سیاسی بحثیں اتنی مرغوب ہو چکی ہیں کہ ہماری مجالس میں خدا اور رسُول کا تذکرہ بھی برائے بیت رہ گیا ہے۔ عبادات میں ہم سخت تساہل کا شکار ہیں اور شاید یہ بھی ہمارے لٹریچر کا غیر شعوری اثر ہے جس میں عبادات کو مقصود کے لئے ذریعہ اور وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔

حضرت مولانا! میرا خط طویل ہو گیا اس میں بعض تکلیف دہ باتیں بھی یقیناً ہوں گی اور آپ ہمیشہ مجھ پر جو شفقت فرماتے رہے ہیں اس کے پیش نظر اتنی جرأت بھی مجھے جسارت نظر آتی ہے لیکن خدا گواہ ہے میں نے یہ سب کچھ معاندانہ جذبے سے نہیں ایک حقیقی بہی خواہ اور ہمدرد کے جذبے سے سپردِ قلم کیا ہے۔ جماعت سے میرا پندرہ سولہ سالہ تعلق مجبور کرتا ہے کہ میں آپ کے دوسرے مشیروں کی طرح محض "سب اچھا" کی رپورٹ آپ کے سامنے پیش نہ کروں بلکہ پوست کندہ حقائق پر آپ کو غور و فکر کرنے کی دعوت دوں۔ اب کیا ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے کبھی سوچتا ہوں ہمیں کھلم کھلا اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہم اپنی اسکیموں میں ناکام ہو گئے ہیں لہٰذا جماعت کے کارکن اور ارکان آزاد ہیں وہ جو راستہ چاہیں اختیار کر لیں۔ کبھی

خیال آتا ہے کہیں ایک بہادر انسان کی طرح مان لینا چاہیئے کہ ہمارا فکر و عمل دونوں غلط تھے اب ہم ارکانِ جماعت کا ایک کُل پاکستان اجتماع بلا کر اپنے لئے از سرِ نو لائحہ عمل ترتیب دیں گے!

یہ سوچ بچار ایک طرف تو اس مایوسی کا مظہر ہے جو میں نے مندرجہ بالا تینوں پہلوؤں میں عرض کی اور دوسری جانب یہ نتیجہ ہے اس تھوڑے بہت احساسِ ذمہ داری کا اور عنداللہ مسئولیت کا جو بچا کھچا میرے اندر موجود ہے اور خطرہ ہے کہ اگر کچھ عرصہ مزید اس نہج پر اپنے قلب و ذہن کے خلاف لکھتا اور بولتا رہا تو کہیں اس متاعِ عزیز سے بھی محروم نہ ہو جاؤں۔ آپ کو میری اس کیفیت کا صحیح اندازہ لگانے میں یقیناً زحمت نہ ہوگی۔ اس کیفیت کے سبب سے ہو سکتا ہے میرے خط میں کہیں تلخی بھی پیدا ہو گئی ہو جس کے لئے پیشگی معافی چاہتا ہوں۔ اب میری اپنی قوت فیصلہ شل ہے اور میں بے چینی سے آپ کے جواب کا منتظر ہوں خدا کرے آپ غم و غصّہ کی بجائے شفقت کیساتھ اس تحریر کا مطالعہ کریں اور مجھے اپنے جواب کے ذریعے اس مایوسی سے نکلنے میں مدد فرمائیں۔

کوثر نیازی

لاہور ۱۲۔ فروری ۶۵ء

جواب

امیر جماعت اسلامی پاکستان

بنام

مولینا کوثر نیازی

محترمی جناب کوثر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا مفصل خط مجھے ملا۔ اس کو بغور پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کو اب سے بہت پہلے جماعت سے الگ ہو جانا چاہیئے تھا۔ آپ نے غلطی کی کہ اتنی طویل مدت سے یہ احساسات رکھنے کے باوجود آپ جماعت کے ساتھ چلتے رہے۔ بہرحال اب مناسب یہی ہے کہ آپ مستعفی ہو جائیں۔ اس کے بعد آپ کا جو طرز عمل رہے گا اس کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی جا سکے گی کہ آپ نے اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ للّٰہ و فی اللہ اور حقیقی بہی خواہی و ہمدردی کے جذبے سے لکھا ہے یا نہیں۔ اگر خدانخواستہ اس کے محرکات کچھ دوسرے بھی ہوئے تو آپ اطمینان رکھیں کہ اس سے پہلے جن حضرات نے بڑی خدا ترسی کے ساتھ مجھ پر کرم فرمائیاں کی ہیں ان کی باتوں پر جس طرح میں نے صبر کیا، آپ کی عنایات پر بھی کروں گا۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

استعفیٰ مولانا کوثر نیازی

بنام

امیر جماعت اسلامی پاکستان

۱۹۔ فروری ۶۵ء

محترم و مکرم جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

امیر جماعت اسلامی پاکستان

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آپ کی طرف سے میرے خط محررہ ۱۲ فروری ۶۵ء کا جواب موصول ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنے خط کے آخری حصّے میں مَیں نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ کہیں ان دردمندانہ معروضات پر غور کرنے کی بجائے آپ غصّے میں نہ آجائیں، وہی ہوا۔ اور آپ نے مختصر جواب میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو غصّے کی حالت میں کہا جا سکتا تھا۔

آپ نے فرمایا ہے کہ جماعت کی پالیسی اور حالات کے متعلّق ایک مدت سے میں جس اضطراب میں مبتلا تھا اُس کے ہوتے ہوئے مجھے بہت عرصہ پہلے جماعت سے مستعفی ہو جانا چاہیئے تھا۔ آپ کا یہ ارشاد بظاہر قابلِ التفات نظر آتا ہے لیکن اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے جذبات میں آنے کی بجائے ٹھنڈے دل سے غور کرتے تو اس طرح کا انداز ہرگز اختیار نہ فرماتے۔ میں نے جن بلند توقعات اور اصلاحِ ذات اور خدمتِ دین کی حسین آرزوؤں کے ساتھ جماعت اسلامی میں شرکت کی تھی، اُن میں اتنی قوّت تھی کہ میں جب بھی جماعت کی تباہ کن غلطیوں سے مضطرب ہو کر جماعت کو چھوڑنے کا ارادہ کرتا تھا مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری رُوح قبض ہو رہی ہے اور یہ ایک ایسی نفسیاتی حالت ہے جسے ہر وہ شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے جس کے پہلو میں دل ہو بلکہ اُس کے لئے والدین اور اعزا اور اقربا کو چھوڑا، اپنوں کو

بیگانہ بنایا اور دنیا بھر سے لڑائی مول لی ہو۔

دوسری وجہ جماعت میں برابر شامل رہنے کی یہ تھی کہ جماعت ایک مدت سے ابتلا کے دور سے گزر رہی تھی اور اگرچہ یہ ابتلا خود جماعت کی بعض غلطیوں کا بھی نتیجہ تھا، لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ جماعت آزمائش اور امتحان کے مرحلے سے گزر رہی ہو اور میں اس سے الگ ہو جاؤں۔ اس طرح تو میں اپنے بعض اوچھے ساتھیوں کو تہمتیں تراشنے اور اپنے خلاف سطحی پروپیگنڈہ کرنے کا موقع خود ہی فراہم کر دیتا۔

یہ قدم نہ اُٹھانے کی تیسری وجہ یہ تھی کہ میں نے ان خرابیوں کو جب کبھی آپ کے سامنے پیش کیا تو آپ نے بظاہر بڑی فکرمندی کا اظہار فرمایا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ آپ ان حالات سے آگاہ بھی ہیں اور اصلاح کا بھی کچھ نہ کچھ جذبہ رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے جب تک میں کُلیتہً مایوس نہ ہو جاتا اور یہ یقین نہ کر لیتا کہ دوسرے حضرات کے ساتھ ساتھ جماعت کو اس غارِ ہلاکت میں دھکیلنے کے خود آپ بھی پوری طرح ذمّہ دار ہیں، میں اس آخری اقدام کے لئے تیار نہ ہو سکتا تھا۔ اور اب جبکہ یہ حقیقت عریاں صورت میں میرے سامنے ہے میں ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر اس فرض سے عہدہ برآ ہو رہا ہوں۔

آپ نے اپنے اندازِ خاص میں میرے آئندہ طرزِ عمل کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

محترم مولانا! میرا ماضی کا طرزِ عمل تو یہ رہا ہے کہ میں نے جماعت کو حق کا علمبردار سمجھا تو اس کی ایک ایک بات کی تبلیغ و تائید میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی اور جن لوگوں نے جماعت کی مخالفت کی اُن کے حملوں سے اُسے محفوظ رکھنے کے لئے اپنی تمام توانائیوں کو نچوڑ دیا اور اس سلسلے میں نہ تو کسی باجبروت قوت سے مرعوب ہُوا اور نہ اپنے تعلّقات عقیدت و محبت اور اپنے دوسرے احوال وظروف کا لحاظ کیا۔ اب اگر میں اپنے سترہ سالہ تجربات کی بناء پر اس آخری فیصلے پر پہنچ چکا ہوں کہ جماعت فکری و عملی دونوں پہلوؤں سے صراطِ مستقیم سے بھٹک چکی ہے اور اس فیصلے کا اظہار میں اس لئے لوگوں کے سامنے کروں کہ جن ہزاروں افراد کو میں نے جماعت سے متعارف کرایا کم ازکم اُن کے سامنے بری الذّمہ ہو جاؤں، تو میرا یہ طرزِ عمل کیوں للّٰہ فی للّٰہ اور حقیقی بہی خواہی پر مبنی نہیں ہوگا؟

مولانا کرم! یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو آپ تجدید و احیائے دین کا کام کرنے کے لئے اولین ضرورت یہ محسوس فرماتے ہیں کہ صدیوں پہلے فوت ہونے والے اُن نفوسِ قدسیہ پر شدید ترین تنقید کریں جو تقویٰ، للٰہیت، اخلاص اور دین کے لئے ایثار کرنے میں ضرب المثل ہوں اور پھر اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے آپ مستقل تصانیف شائع فرمائیں لیکن اگر کوئی شخص دیانتداری سے مسلسل تجربات و شواہد کے بعد آپ کے بارے میں یہ رائے قائم کرے کہ آپ کا طرزِ عمل غلط ہو یا دین کے خلاف یا مسلمانوں کے لئے گمراہ کن ہے اور وہ اپنی اس رائے کو باقاعدہ دلائل کے ساتھ پیش کرے تو آپ اُس شخص کے بارے میں یہ فتویٰ صادر فرما دیں کہ یہ اخلاص اور للٰہیت سے محروم ہو چکا ہے اور بعض "دوسرے" محرکات کے تحت یہ کام کر رہا ہے۔

مولیٰنا محترم! آپ نے بین السطور کچھ "دوسرے محرکات" کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ میں حیران ہوں اس کے بارے میں کیا عرض کروں جماعت کے احوال و کوائف سے آگاہی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ۱۹۴۱ء سے لے کر اب تک جس کسی شخص نے (خواہ وہ کتنا ہی متقی، خدا ترس، اور دین کے لئے سراپا ایثار کیوں نہ ہو) جماعت سے اختلاف کیا یا علیحدگی اختیار کی، آپ نے ہمیشہ اُس کے بارے میں انہی "دوسرے محرکات" کا ذکر فرمایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اس اختلاف میں مخلص نہ تھا۔ اگر بہت سے خدامِ دین اور بعض اہل اللہ تک کے بارے میں آپ دوسرے محرکات کا ذکر فرماتے رہے ہیں تو مجھ ایسا سراپا معصیت آپ کی اس نوازش پر شکوہ سنج کیوں ہو، البتہ یہ بات انتہائی تعجب کا باعث ہے کہ کل تک جو شخص خود آپ کے نزدیک پورے حلقہ کے قیم سے لے کر امیر تک کے لئے انتہائی موزوں آدمی تھا، اس فیصلے کے بعد آپ اس کے "دوسرے محرکات" کو متعین فرمانے لگے ہیں کیا اس طرزِ عمل کے بعد ان لوگوں پر تنقید کی جا سکتی ہے جو سیاسی اختلافات کے بعد اپنے مخالفین کو بددیانت اور مفاد پرست کہہ کر دیانتداری کے اجارہ دار بنتے ہیں؟

جماعت میں میری شمولیت کے محرکات کیا تھے اور تھوڑی بہت خدمتِ دین یہ توفیقِ ایزدی میں نے انجام دی ہے اُس کے محرکات کیا تھے اور اب اس فیصلے اور آپ کے اس طرزِ عمل کے خلاف اظہارِ رائے کے محرکات کیا ہیں؟ ان کا بھید اُس روز کھلے گا جس دن تمام چہروں سے

نقاب اُٹھ جائے گا اور اس دن میں داورِ محشر کے حضور آپ سے ان دوسرے محرکات کو متعین کرنے کا سوال کر سکوں گا۔

مولینا! آپ کے اس خط کے بعد اب میں جماعت میں شریک رہنے کا کوئی جواز نہیں پاتا۔ لہٰذا میں جماعت اسلامی کی رکنیت سے مستعفی ہوتا ہوں اور اپنے رؤف و رحیم رب سے انتہائی شرمساری اور عاجزی کے ساتھ دُعا کرتا ہوں کہ جماعت کے جبری نظام کے تحت میں نے جماعت کی جن باتوں کی تائید کی ہے اور بالخصوص جن بعض دینی حقائق کو جماعت کے غلط فیصلوں کی وجہ سے غلط تاویلات کی صورت میں پیش کرنے کا مرتکب ہُوا ہوں اللہ تعالےٰ انہیں معاف فرمائے اور مجھے اس کی تلافی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

کوثر نیازی

لاہور۔ ۱۹ فروری ۶۵ء

ن 1965ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے -
سالانہ چھ روپے (پندرہ شلنگ)

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۱۱	محرم الحرام صفر سنہ ۱۳۸۵ھ	شمارہ ۶

فہرست مضامین

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ:۔

ناظم ماہنامہ میثاق، رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲

ایڈیٹر سے مراسلت کا پتہ:۔ ۶۵ ۔ اے ۔ فیروز پور روڈ ۔ لاہور

ہندوستانی خریداروں کے لئے ترسیلِ زر کا پتہ:۔

منیجر دائرۂ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ (یو۔پی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

۲۰ مئی کو قاہرہ کے قریب پی، آئی، اے کے طیارہ کو جو المناک حادثہ پیش آیا وہ یوں تو پورے پاکستان کا ایک المیہ ہے، ہماری پوری قوم کو اس سے صدمہ پہنچا ہے اور میں اس میں قوم کے ساتھ برابر کا شریک ہوں، لیکن میرے لئے یہ حادثہ دہرے رنج و غم کا باعث ہوا ہے اس لئے کہ میرے جوان بیٹے ابو صالح اصلاحی نے بھی اس حادثے میں شہادت پائی۔ میں گزشتہ پچیس سال کا بنا ہوا ایک کمزور انسان ہوں، عام حوادث سے بھی، جن کی خبریں اخباروں میں روزانہ چھپتی رہتی ہیں، بہت زیادہ متاثر ہوتا ہوں پھر ایک ایسے حادثے کے اثرات سے اپنے دل کو کیسے بچا پاتا جس نے میرے پورے آشیانے کو سوختت کر کے رکھ دیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ دن مجھ پر بہت سخت گزرے ہیں۔ اتنی عمر میں ایسے سخت دن مجھ پر نہیں گزرے تھے۔ اگرچہ حادثے کی خبر سنتے ہی میں نے اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالہ کر دیا تھا کہ اے رب! اگر یہ تیرے غضب کا نتیجہ نہیں ہے تو میں تیرے فیصلے پر راضی ہوں، تو مجھے صبر و رضا کی توفیق عطا فرما لیکن اس کے باوجود اس دوران میں میری عقل اور میرے دل میں برابر ایک جنگ برپا رہی ہے اور بارہا میں نے شب کی تنہائیوں میں یہ محسوس کیا ہے کہ میرے جذبات میری عقل پر غالب آ رہے ہیں۔ لیکن اب ان جذبات کا ذکر چھیڑ کر اپنے اور اپنے ہمدردوں کے غم میں مزید اضافہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر بعض ایسی باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اس سلسلے میں رب کی طرف سے ظہور میں آئی ہیں اور جن سے مجھے اس غم و الم کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سفر میں ابو صالح مرحوم نے عمرہ کی نیت کی تھی اور اس کے لئے

وہ تمام ضروری تیاریاں کرکے گھر سے نکلے تھے۔ ان کے اس ارادے کی اطلاع میرے برادرِ نسبتی چوہدری فضل الرحمان محمود دسلمہ کو تو کئی ماہ پہلے سے تھی لیکن سفر سے پہلے پہلے انہوں نے اس کی خوشخبری اپنی امی کو اور ان کی وساطت سے گویا مجھے بھی دیدی تھی۔ میں مئی کے شروع میں زمینداری کے انتظامات کے سلسلے میں اپنے رقبے پر چلا گیا تھا۔ وہاں مجھے یکے بعد دیگرے ایسے کام پیش آتے گئے کہ توقع سے زیادہ دن لگ گئے۔ میری اس غیر معمولی تاخیر سے گھبرا کر میری اہلیہ اور میری چھوٹی لڑکی بھی وہیں پہنچ گئیں، حادثہ سے ایک دن پہلے میری اہلیہ نے ذکر کیا کہ ابوصالح مشرقِ وسطیٰ کے سفر پر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا ' یہ کیا نئی بات ہوئی ' وہ تو چین ماچین امریکہ اور انگلستان برابر جاتے ہی رہتے ہیں؟ انہوں نے کہا نئی بات یہ ہے کہ اب کے انہوں نے عمرہ کی نیت کی ہے، میرے پاس آئے تو کہتے تھے کہ ' امی آپ تو مجھے دین سے بے پروا سمجھتی ہیں لیکن میں عمرہ کی نیت کئے ہوئے ہوں ' اس سفر سے عمرہ کرکے لوٹوں گا ' میں دن میں دفتر کے کام کرتا ہوں ' رات کو حج کی دعائیں یاد کرتا ہوں، حج کے سفرنامے میں نے کئی ایک پڑھ لئے ہیں ' اگر کوئی ایسا سفرنامہ آپ نے پڑھا ہو جس میں حج کی روحانیت بیان ہوئی ہو تو وہ مجھے بتائے ' اباجان سے بھی پوچھے گا ' میں نے کہا ہاں، یہ خبر تو بے شک نئی خبر ہے۔ اس اطلاع سے مجھے فی الواقع بڑی خوشی ہوئی تھی۔

ابوصالح نے اس نوجوانی کی عمر میں اخبار نویسی میں جو ناموری حاصل کر لی تھی اور زندگی کی جدوجہد میں اسے جو کامیابی پر کامیابی حاصل ہو رہی تھی وہ اگر ایک طرف قابلِ رشک تھی تو دوسری طرف ایک خاص پہلو سے میرے لئے وجہ تشویش بھی تھی۔ میرا دل اندر سے ڈر رہا تھا کہ مبادا ان کامیابیوں کا نشہ اس کو آخرت سے غافل کر دے۔ چنانچہ میں اس کے لئے برابر دعا کرتا رہتا تھا کہ اے رب تو نے اس کو دنیا دی ہے تو ہی دین کی راہ بھی اسے سجھا۔ اس کی امی برابر جب وہ ہم سے ملنے آتا، نماز کی پابندی کی بحث اس سے ضرور چھیڑتیں۔ میں نے بھی اس سے ایک آدھ بار کہا کہ ابوصالح تم قابلِ فخر بیٹے ہو اگر تم دیندار بن جاؤ تو میں تمہارے جیسے بیٹے پر اپنے رب کا شکر بھی ادا کروں ——— اس میں غفلت ضرور تھی لیکن طبیعت بڑی نصیحت پذیر تھی۔ دین کے لئے اس میں حمیت بھی بہت تھی۔ اب میں اس کی اس غربت کی موت کا خیال کرتا ہوں ' ان آگ کے شعلوں کا تصور کرتا ہوں جن میں اس کا جسم اور میرا دل کباب ہوا ہے، ایک حریق اور غریق مومن

کے لئے اس شہادت کو یاد کرتا ہوں جس کا ذکر حدیثوں میں ہے اور پھر اس کی عمرہ کی اس نیّت کا دھیان کرتا ہوں تو میرا سینہ اس اچھی امید سے لبریز ہوجاتا ہے کہ کیا عجب رب رحیم وکریم نے اس المطر نوجوان کو اپنی جنت میں لے جانے کے لئے یہ مختصر راستہ ہی پسند فرمایا ہو۔ یہ امید میرے غم کو اتنا کم کردیتی ہے کہ بعض اوقات تو میں ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ گویا کوئی حادثہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس غمناک حادثہ پر اتنے   اللہ کے بندوں اور بندیوں نے تار، خطوط، بالمشافہ ملاقاتوں اور بالواسطہ پیغاموں کے ذریعے سے میری اور میرے خاندان کی تعزیت کی ہے کہ میں اُن کا شمار نہیں کرسکتا۔ ان کی ہمدردیوں میں بڑا اخلاص اور ان کی دعاؤں میں بڑا سوز و درد مجھے محسوس ہوا ہے، کتنوں نے غریبوں کو کھانے کھلائے ہیں، کتنوں نے ایصالِ ثواب کے لئے قرآن خوانی کی ہے، کتنوں نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی ہے اور کتنوں کے خطوط اور ان کی ملاقاتوں سے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے دل اس حادثہ سے مجھ سے بھی زیادہ زخمی ہیں۔ بہتوں نے اطلاع دی ہے کہ ہم اور ہمارے اہل وعیال راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اور رو رو کر مرحوم کے لئے دُعائیں کر رہے ہیں۔ ان میں عوام کے ساتھ ایسے علما و صلحا بھی شامل ہیں جن کے علم و تقویٰ کی میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ میں یہ ہمہ گیر تاثر جب دیکھتا ہوں تو اس کا اہل نہ اپنے آپ کو پاتا نہ مرحوم ابوصالح کو۔ مجھے یہ چیز بالکل خدا ساز نظر آتی ہے۔ رب کریم و کارساز نے جب اپنے ایک بندے کو اپنی رحمت سے نوازنا چاہا تو اس کی موت کو ایک ایسی شکل دے دی کہ اس کے لئے بے شمار ہاتھ دُعا کے واسطے روتی ہوئی آنکھوں اور تڑپتے ہوئے دلوں کے ساتھ خود بخود اُٹھ گئے۔
اب میں یہ گمان کس طرح کروں کہ دُعا کے لئے جو ہاتھ اس نے خود اُٹھوائے ہیں انہیں وہ محروم لوٹائے گا۔ اس خیال سے میری رُوح مسرت سے وجد میں آجاتی ہے اور سارا غم و الم کافور ہوجاتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ میرے بعض بزرگوں اور ہمدردوں نے اس حادثہ پر مجھے تعزیت کے بجائے مبارکباد کے خطوط لکھے ہیں۔ یہ مبارکباد دینے والے حضرات علم اور تقویٰ دونوں میں ممتاز

مقام رکھتے ہیں۔ میں یہ حسنِ ظن رکھتا ہوں کہ انہوں نے محض مجھے تسلی دینے کے لئے مبارکباد نہیں دی ہے بلکہ ابو صالح کی یہ موت ان کے نزدیک فی الواقع شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔ شہادت کا درجہ ایک بہت بڑا درجہ ہے۔ اگر ابو صالح نے یہ درجہ حاصل کیا تو بہت بڑا درجہ حاصل کیا، شہادت کی موت پر ہزاروں زندگیاں قربان! میں تصور بھی نہیں کرتا تھا کہ میرے حقیر خاندان میں کوئی اس درجہ کا سزاوار قرار پائے گا۔ جب میں اس کے اس درجے کا خیال کرتا ہوں، جو یقیناً رب کریم نے محض اپنے فضل سے بخشا تو میری رُوح اپنے رب سے سخت شرمسار ہوتی ہے کہ میں نے ابو صالح کی موت کا غم کیوں منایا، اس پر سجدہ شکر کیوں نہ بجا لایا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام دوستوں اور ہمدردوں کو جزائے خیر دے جنھوں نے اس حقیقت کی طرف مجھے توجہ دلائی۔

ایک اور چیز جو سب سے زیادہ میرے غم کو دور کرنے میں معین ہوئی وہ میرے ایک دیرینہ رفیق کا خواب ہے۔ میں اگرچہ خواب کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا لیکن یہ ایک ایسے شخص کا خواب ہے جس کے خوابوں کے سچے ہونے کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ میں ایک زمانے میں ان کے ساتھ کم و بیش دس ماہ پورسٹل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں گزار چکا ہوں۔ اس زمانے میں انہوں نے پیش آنے والے معاملات سے متعلق نہایت حیرت انگیز خواب دیکھے اور ان کے سارے خواب سچے ثابت ہوئے۔ انہوں نے ۳۰-۳۱ مئی کی درمیانی رات میں، صبح تقریباً چار بجے، مندرجہ ذیل خواب دیکھا جو خود ان کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں۔

"ابو صالح اصلاحی مرحوم، رات کے لباس میں ہلکے رنگ کے بوشرٹ اور پاجامے میں ملبوس ہشاش بشاش نظر آئے۔ کہنے لگے کہ مجھے صرف آدھ گھنٹہ تکلیف رہی۔ اب میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں (یہ بات انہوں نے دو تین دفعہ کہی) میں نے کہا آپ کے والد مولانا اصلاحی صاحب اس حادثہ کی وجہ سے سخت غمزدہ ہیں۔ کہنے لگے ہاں ٹھیک ہے، انہیں سخت غم ہے اور کیوں نہ ہو، اب پوری ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آن پڑی ہیں۔"

"نیز کہنے لگے آپ میرا MESSAGE (پیغام جو اوپر نقل ہوا) میرے گھر والوں کو

پہنچا دیں۔ میں نے کہا (اور احساس یہ تھا کہ میں یہ خواب دیکھ رہا ہوں) کہ یہ خواب کی باتیں شاید وہ مانیں یا نہ مانیں، میں جا کر کیا MESSAGE دوں گا۔ لیکن انہوں نے باصرار دو تین دفعہ کہا کہ آپ کو اس سے کیا، آپ پیغام دے دیں، وہ مانیں یا نہ مانیں اُن کی مرضی۔"

"خواب خاصا لمبا تھا، باتوں کی ترتیب پوری طرح یاد نہیں رہی لیکن گفتگو کے وہ حصے ذہن پر ابھی تک نقش ہیں جو اوپر لکھ دیئے ہیں۔"

"اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا کہ اُن کے تین چار دوست ان کے قریب اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں اور بغیر داڑھی مونچھ کے سفید قمیص اور پتلون میں ملبوس ہیں۔ ان میں سے ایک نے ابو صالح سے پوچھا، بھئی نماز کا وقت ہو رہا ہے (اس وقت واقعی فجر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا) ہمیں وضو کرنا ہے جگہ تو بتاؤ۔ اس پر ابو صالح نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میرے میز والے کمرے کے ساتھ غسل خانہ ہے وہاں وضو کر لیں۔"

اس خواب کی تعبیر تو ارباب تعبیر بتا سکیں گے لیکن چند باتیں اس کی مجھ پر بالکل واضح ہیں اور وہی میرے لئے موجب اطمینان و تسلی ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ خواب دیکھنے والے ایک ایسے صاحب ہیں جن سے اگرچہ ایک مدت سے میرا کوئی ربط ضبط نہیں ہے لیکن وہ واحد شخص ہیں جن کے بارے میں میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ان کے خواب سچے ثابت ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کے واسطہ سے ابو صالح مرحوم کا کوئی پیغام میرے لئے اطمینان کا پہلو رکھتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ حادثے کے بعد دو تین دنوں کے اندر اندر میں نے غم کے تمام اسباب کا تجزیہ کر کے ان میں سے اکثر پر قابو پا لیا تھا لیکن ایک سوال میرے لئے برابر سوہان رُوح رہا ہے کہ حادثہ کے وقت اور حادثہ کے بعد رب کریم نے ابو صالح کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ رات میں جب یہ سوال میرے ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے تو نیند اُچاٹ ہو جاتی ہے۔ میرے دل میں؛

خواہش بھی بار بار پیدا ہوئی کہ کوئی بات میرے سامنے ایسی آئے جس سے میرے دل پر سے یہ پہاڑ ذرا سرکے، خواب ہی میں سہی، لیکن میں خود خواب اوّل تو دیکھتا کم ہوں اور جو دیکھتا ہوں وہ یاد نہیں رہتے۔ اب جب سے یہ خواب علم میں آیا ہے خیال یہی گزرتا ہے کہ یہ میرے اسی سوال کا جواب ہے اور اگر یہ واقعی میرے سوال کا جواب ہے تو بہت ہی خوب اور نہایت مبارک جواب ہے۔

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست!

خواب میں ابو صالح کے لباس شب خوابی کا جو رنگ نمایاں ہوا ہے گھر میں دریافت سے معلوم ہوا کہ ان کے سلیپنگ سوٹ کا رنگ فی الواقع وہی تھا۔ اسی طرح اُن کا وہ کمرا جس میں ان کے کھانے کی میز ہے ان کے صاف ستھرے غسل خانے سے متصل ہے۔ ان چیزوں کا کوئی تصور خواب دیکھنے والے صاحب کو پہلے سے نہیں تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس حادثے نے مجھے اندر سے بالکل ہلا ڈالا تھا لیکن اب میرے رب نے مجھے سنبھال لیا ہے۔ کبھی کبھی تنہائی میں رونے کو اب بھی جی چاہتا ہے لیکن الحمدللہ اس معاملے میں مجھے اپنے پروردگار سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میرا دل بالکل مطمئن ہے کہ جو کچھ ہوا ہے اسی میں سب کی بہتری ہے۔ مرحوم کی بھی، اسکے ننھے ننھے بچوں کی بھی، اس کی عزیزہ بیوہ کی بھی، اس کے غمگین ماں باپ اور بھائیوں بہنوں کی بھی۔ میں اس موقع پر ان تمام مخلصین اور ہمدردوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مرحوم کے لئے دعائیں کی ہیں اور تعزیت کے کلمات سے ہمارے غم میں شرکت کی ہے جن مخلصین نے خطوط لکھے ہیں اگر میرے لئے ممکن ہوسکا تو میں اُنکے جواب لکھوں گا اور ان کا شکریہ ادا کروں گا، اگر یہ ممکن نہ ہوسکا تو مجھے امید ہے کہ یہ مخلصین مجھے معذور سمجھیں گے اور مرحوم کو اور اُس کے بچوں کو اپنی دعاؤں میں برابر یاد رکھیں گے

اگر ابو صالح کا غم تنہا میرا ہی غم ہوتا تو میں اس کا ذکر ان صفحات میں نہ کرتا بلکہ اس کو اپنے سینے کا راز بنا کر اس کو اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا لیکن حادثے کی نوعیت نے اس کو ایک قومی غم

بنا دیا ہے۔ اب ابوصالح تنہا میرے نواہی نہیں تھے بلکہ اپنی پوری قوم کے تھے اس کی صلاحیتیں پوری قوم کا سرمایہ تھیں۔ اس نے زندگی مختصر پائی لیکن شاندار پائی۔ کہنے کو تو وہ کوہستان سے طلوع ہوا، مشرق میں چمکا، قاہرہ میں غروب ہوگیا لیکن اتنی ہی مدت میں اس کے قلم نے ملک کی صحافت کی تاریخ میں اس کے کام اور نام کو زندہ جاوید بنا دیا۔ ۳۶ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے لیکن اتنی ہی عمر میں اس نے صحافت میں وہ مقام حاصل کیا کہ آج ہماری صحافت کے اساطین و عمائد اس کو جدید دورِ صحافت کے بانیوں کی صفِ اوّل میں شمار کرتے ہیں۔ باپ کی نگاہوں میں بیٹا ہمیشہ بچہ ہی رہتا ہے اور وہ تو ابھی بچہ ہی تھا بھی لیکن اس کے قلم کی پختگی، شگفتگی اور معنی آفرینی پر مجھے بھی سخت حیرانی ہوتی تھی اور میں دل میں کبھی کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ اگر اس لڑکے کو زندگی ملی تو میرا خاندان بھی صحافت اور اردو زبان کی کچھ خدمت کر جائے گا ـــــ اس کی زندگی کا یہ پہلو اجتماعی نوعیت رکھتا ہے اس وجہ سے میں نے یہ چند حرف لکھ دئے ہیں اور اگر طبیعت نے ساتھ دیا تو شاید میثاق کے آئندہ شمارے میں اس کی زندگی کے بعض ایسے گوشوں کو بھی روشنی میں لانے کی کوشش کروں جن سے باپ ہونے کے سبب سے میں ہی واقف ہوں۔ عجب نہیں کہ ہونہار نوجوانوں کو ان سے فائدہ پہنچے۔ یہ فائدہ مدنظر نہ ہوتا تو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ایک حرف بھی اس غم کا ظاہر کرنا میں پسند نہ کرتا۔ رونا تنہائی ہی کا اچھا ہوتا ہے۔

انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ

تدبر قرآن
امین احسن اصلاحی

۴

تفسیر سورۂ آل عمران

۶۔ ایمان بالقسط ایمان کے اہم ارکان میں سے ہے

اس مجموعۂ آیات میں جو تعلیم امت کو دی گئی ہے آیات کی وضاحت کے ضمن میں بقدر ضرورت ہم اس پر روشنی ڈال چکے ہیں لیکن ایمان باللہ کے ذیل میں اللہ تعالیٰ کے قائم بالقسط ہونے کی صفت کا جو حوالہ ہے یہ ایمان کے نہایت اہم اجزا میں سے ہے اور اسلام کی حقیقت میں تو اس کو اس درجہ دخل ہے کہ گویا اسلام عبارت ہی اسی سے ہے۔ اس کی یہ اہمیت تقاضا کر رہی ہے کہ اس کے متعلق استاذ امام رحمہ اللہ کے چند نکات یہاں درج کر دئے جائیں تاکہ جو لوگ حکمت دین پر غور کرنا چاہتے ہیں وہ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ مولانا رحمہ اللہ کے نزدیک اس صفت کی اہمیت مندرجہ ذیل پہلوؤں سے ہے۔

۱۔ ایمان امن سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اعتماد و اعتقاد اس کی فطرت ہی داخل ہے۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ایمان کے لئے ناگزیر ہے کہ آدمی کو اللہ کے وجود پر یقین راسخ ہو۔ لیکن یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک یہ اعتماد نہ کیا جائے کہ عقل اصلاً رہنمائی کے لئے بنی ہے نہ کہ گمراہ کرنے کے لئے۔ یعنی یہ مانا جائے کہ عقل اپنی فطرت کے لحاظ سے انسان کے اندر ایک میزان قسط ہے۔ پھر یہ چیز ایک اور نتیجہ کو مستلزم ہے کہ فطرت

کو اس کے فاطر نے حق و عدل کے اصولوں پر استوار کیا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بہمہ وجوہ عدل و قسط، عدل و قسط کو پسند کرنے والا اور اس کو قائم کرنے والا ہے۔ یہ تمام نتائج عقلاً لازم بلکہ بدیہیات میں سے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے حق ہونے کا ثبوت اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک فاطر فطرت کو حق و عدل نہ مانا جائے۔ اسی سے اس کے تمام افعال کا حق و صدق ہونا ثابت ہوگا۔ جس طرح عقلاً یہ چیز لازم ہے اسی طرح اخلاقی مسلمات سے بھی اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نیکی کو اللہ تعالیٰ نے فطرت میں داخل کیا ہے اور دلوں میں اس کے قبول کرنے اور اس کی عزت کرنے کی رغبت ودیعت فرمائی ہے۔ ایسی حالت میں ہمارے لئے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم خود تو نیکی کو پسند کریں اور خدا کو نیکی کو پسند کرنے والا نہ قرار دیں۔ ہم اپنی اس خیر پسندی کی صحت و اصابت پر اطمینان کس طرح کر سکتے ہیں اگر خود فاطر کی خیر پسندی پر ہمارا دل مطمئن نہ ہو۔ ہم اس کو نیکی کر کے خوش کرنا تو اسی وجہ سے چاہتے ہیں کہ ہم یہ اطمینان رکھتے ہیں کہ وہ نیکی کو پسند کرتا ہے۔ اس کو اچھی صفات سے موصوف کرنا بھی اسی بنیاد پر ہے کہ ان صفات کو پسند کرنے کے معاملے میں ہمیں اپنی فطرت کے صحیح ہونے پر پورا اعتماد ہے

۲۔ دوسرا یہ کہ ایمان کی اصل خدا کی محبت ہے۔ ہم ایک ایسے معبود پر ایمان رکھتے ہیں جس سے ہم محبت کرتے ہیں، جس سے امید رکھتے ہیں اور جس کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ یہ چیز اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک ہمیں یہ یقین نہ ہو کہ وہ ظلم و نا انصافی کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ وہ اپنا انعام انہی پر فرمائے گا جو اس کی اطاعت کریں گے اور سزا انہی کو دے گا جو اس کے مستحق ٹھہریں گے۔ کسی ظالم و نا منصف آقا سے محبت کرنا انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات پر غور کرنے سے فطرت میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا جو تقاضا ابھرتا ہے اس کی بنیاد شکر پر ہے۔ یہ شکر اس صورت میں لازم ہوتا ہے جب ہم یہ مانیں کہ یہ منعم کا حق اور اس کے انعام کا مقتضا ہے۔ یہی رمز ہے کہ قرآن میں شرک کو ظلم اور ایمان کو شکر قرار دیا گیا ہے۔ اسی اصول پر تمام حقوق کے استحقاق کی بنیاد ہے

کے وجوب پر رکھی گئی ہے۔ یہ شریعت اور قانون کی ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اس وجہ سے ہر شریعت کی اساس و بنیاد قسط ہے۔

۴۔ چوتھا یہ کہ ایمان کا ثمرہ اطاعتِ الٰہی ہے اور اطاعت کا ثمرہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر گوشے میں اعمال اور ان کے اثرات میں یہ رشتہ اپنے خلق و تدبیر اور اپنے امر و حکم سے قائم کر رکھا ہے اور مختلف طریقوں سے اس حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور ہم چونکہ اعمال کے ان نتائج پر پورا اعتماد رکھتے ہیں اس وجہ سے اس کے وعدے پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگر اس بات پر ہمارا ایمان نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کر سکتا تو تمام اعمال کی بنیاد ہی ڈھے جائے گی اور پھر سارا اعتماد ان چیزوں میں سے کسی ایک چیز پر رہ جائے گا یا تو نصاریٰ کی طرح جھوٹی شفاعت پر جن کا سارا اعتماد حضرت مسیحؑ پر ہے جن کو معبود بنا کر وہ اُن کی عبادت کرتے اور جن سے خُدا سے بڑھ کر محبت کرتے ہیں یا پھر یہود کی طرح کامل سرگشتگی اور ناعاقبت بینی پر۔ انہوں نے ہوا کے رُخ پر اپنی کشتی چھوڑ دی، اپنے تکبر اور حسد کے سبب سے وہ خُدا کے فیصلے پر راضی نہ ہوئے، گویا اُن کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ہاں نیک اور بد میں امتیاز کے لئے کوئی ضابطہ ہی نہیں ہے۔ اس ضلالت سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس بات پر پورا یقین رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ قائم بالقسط ہے، اس کا ہر حکم عدل اور اس کا ہر وعدہ سچا ہے۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے۔ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔

ان پانچوں پہلوؤں پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ ایمان بالقسط ایمان کے نہایت اہم ارکان میں سے ہے اور اس پر عقائد، اخلاق اور شرائع کے نہایت بنیادی مسائل مبنی ہیں۔

۷۔ آگے کا مضمون آیات ۲۳-۲۷

۷۔ آگے کا مضمون آیات ۲۳-۲۷

پہلے اِن منکرینِ قرآن کی حالت پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے ان سے توقع تو اس بات کی تھی کہ جس کتاب کا ایک حصہ ان کو دیا گیا تھا لیکن اپنی بدبختی سے اس کو

انھوں نے ضائع کر دیا اس کو از سرِ نو اس کی مکمل صورت میں پاکر اس کی قدر کریں گے اور اس کی روشنی میں اپنے تمام اختلافات رفع کر کے نئے سرے سے عدل و حق کی راہ اختیار کریں گے لیکن انھوں نے حسب عادت اعراض ہی کی روش اختیار کی۔

اس کے بعد ان کے اس اعراض کے ایک نہایت اہم سبب کا سراغ دیا ہے کہ یہ اپنے آپ کو ایک برگزیدہ اُمت سمجھنے کی وجہ سے یہ غلط عقیدہ ایجاد کر بیٹھے ہیں کہ یہ دوزخ کے عذاب سے بہر شکل محفوظ ہیں، اول تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو بس سرسری طور پر کچھ سزا بھگت کر اس سے نجات پا جائیں گے۔ یہ عقیدہ اُن کی ایک من گھڑت ایجاد ہے جس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اسی خود فریبی نے اُن کو ان کے دین سے بالکل غافل کر دیا ہے حالانکہ ایک دن رتی رتی کا حساب ہونا ہے۔ اس دن ان کی آنکھیں کھلیں گی کہ ان کا سارا کیا دھرا ان کے سامنے موجود ہے اور خدا کی میزان نے نہ ان کے ساتھ کوئی رعایت کی ہے اور نہ کوئی کمی۔

اس کے بعد اس امر کا اعلان ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ اب منصب امامت سے معزول ہوئے اور شریعتِ الٰہی کی یہ امانت اُس اُمت کے سپرد کی جا رہی ہے جس کو خدا نے اس امانت کا اہل پایا ہے۔ مالک الملک خُدا ہی ہے " وہ جس سے چاہے چھینے اور جس کو چاہے بخشے، عزت اور ذلت سب اسی کے ہاتھ میں ہے، رات کو دن میں داخل کرنا اور زندہ کو مُردہ سے نکالنا اسی کا کام ہے۔ یہ بات خبر کے بجائے دُعا کے اسلوب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے آپ کے صحابہؓ کو تلقین کی گئی ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بارگراں اب جن کے کندھوں پر ڈالا جا رہا ہے وہ اس کو خُدا کی امانت سمجھیں اور اس کے اٹھانے میں اسی کے سہارے کے طالب بنیں۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۳ تا ۳۲

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ
فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ ۝ ۲۳ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ وَ
غَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ ۲۴ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ

وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝٢٥ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ
تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ
الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٢٦ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ
الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝٢٧

ذرا ان کو تو دیکھو جن کو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ عطا ہوا، ان کو اللہ کی کتاب ہی کی طرف دعوت دی جا رہی ہے تاکہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے۔ پھر ان کا ایک گروہ مُنہ پھیر لیتا ہے اور یہ مُنہ پھیر لینے ہی والے لوگ ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ کی آگ بس گنتی کے چند دن چھوئے گی۔ یہ جو کچھ گھڑتے رہے ہیں اس نے ان کو ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ اس وقت کیا ہوگا جب ہم ان کو ایک ایسے دن کے لئے اکٹھا کریں گے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے اور ہر جان کو جو اس نے کمائی کی ہوگی پوری کی جائے گی، ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ۲۳۔ ۲۵۔

دُعا کرو، اے اللہ، بادشاہی کے مالک، تو ہی جس کو چاہے بادشاہی دے جس سے چاہے بادشاہی چھینے اور تُو ہی جس کو چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلت دے، تیرے ہی ہاتھ میں خیر ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور ظاہر کرتا ہے مُردہ کو زندہ سے اور تو جس پر چاہتا ہے اپنا بے حساب فضل کرتا ہے۔ ۲۶۔ ۲۷۔

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور جُملوں کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ
يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝٢٣

الم تر کے خطاب کی نوعیت

'اَلَمْ تَرَ' کے خطاب پر ہم سورہ بقرہ میں لکھ چکے ہیں۔ ہر جگہ اس کو واحد کے معنی میں لینا صحیح نہیں ہے، اس کا خطاب جماعت سے بھی ہوتا ہے، گویا فرداً فرداً جماعت کا ہر فرد مخاطب ہوتا ہے۔ پھر یہ محض ایک سادہ خطاب ہی نہیں ہے بلکہ یہ فی الجملہ

اظہار تعجب کا مفہوم بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں نسبت جزو و کل کی ہے

"نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ" سے مراد تورات اور انجیل وغیرہ ہیں اور کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔ جس طرح پچھلے آسمانی مذاہب اور شریعت اسلامی میں نسبت جزو اور کل کی ہے اسی طرح دوسرے آسمانی صحیفوں اور قرآن میں بھی نسبت جزو اور کل کی ہے۔ اللہ کی شریعت انسانی ذہن اور انسانی معاشرہ کے تدریجی ارتقا کے لحاظ سے درجہ بدرجہ عطا ہوئی ہے۔ جب تک انسان، کامل شریعت اور کامل کتاب کا اہل نہیں ہوا تھا اس وقت تک اس کو کامل شریعت اور کامل کتاب نہیں دی گئی بلکہ اس کے حالات اور اس کی ضروریات کے مطابق کتاب دی گئی لیکن یہ کتاب اصلاً اس کامل شریعت اور اس کامل کتاب ہی کا ایک حصہ تھی جو اس کے لئے پہلے سے خدا کی اسکیم میں مقرر تھی۔ انبیائے بنی اسرائیل نے جو تعلیم دی وہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے کوئی الگ چیز نہیں بلکہ اسی تعلیم کا اتنا حصہ تھا جو ان کے دور اور ان کے حالات کے لئے موزوں تھا، اسی طرح تورات اور انجیل قرآن مجید سے کوئی الگ چیز نہیں ہیں بلکہ اسی صحیفۂ کامل کے یہ وہ اوراق تھے جو آخری اُمّت سے پہلے کی اُمتوں کے لئے نازل ہوئے۔ اس طرح گویا تمام آسمانی کتابیں ایک ہی کتاب الٰہی کے مختلف حصے اور مختلف ابواب کی حیثیت رکھتے ہیں، اصلاً اور فطرتاً ان میں کامل ہم آہنگی و ہم رنگی ہے۔ اگر تورات اور انجیل میں ملاوٹ اور تحریف نہ واقع ہوئی ہوتی تو ان کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں اجمال و تفصیل اور آغاز و تکمیل کے سوا کوئی فرق نظر نہ آتا تاہم آج بھی ایک صاحب نظر آسانی سے یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ سب صحیفے ایک ہی مشکوٰۃ علم و معرفت کے انوار اور ایک ہی شجرہ طوبیٰ کے برگ و بار ہیں۔ اس باہمی یک رنگی کی وجہ سے ان لوگوں کے لئے جو تورات و انجیل کو جانتے اور مانتے ہوں قرآن کا پہچاننا کچھ مشکل نہ تھا بشرطیکہ انہوں نے اپنی آنکھوں پر تعصب اور ضد کی پٹیاں نہ باندھ رکھی ہوتیں۔ جس کتاب کے ابتدائی ابواب انہوں نے پڑھے ہوں، جس کے انداز، اسلوب اور مزاج سے آشنا ہوں، جس کی ہدایات و تعلیمات کا ابتدائی عکس اور خاکہ انہوں نے دیکھا ہو، جس کی پیشین گوئیوں سے وہ باخبر اور ان کے مصداق کے منتظر ہوں، یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ کتاب عزیز جب اپنے اصلی جمال و کمال کے روپ

میں نمایاں ہو تو وہ اس کو نہ پہچان سکیں۔ پھر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اہل کتاب نے اس سے منہ موڑا اور جان کر اس سے انجان بن گئے!

'لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ' یہ قرآن کا وہ مقصد بیان ہوا جو اہل کتاب کو، اگر وہ اللہ کی شریعت کے قدر داں ہوتے تو بہت عزیز ہونا تھا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل اتاری تھیں لیکن انہوں نے ان میں بہت سے اختلافات پیدا کر دئے اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو فرقان بنا کر اُتارا تاکہ یہ تمام اختلافات کا فیصلہ کر کے اصل حق کو پھر واضح کر دے۔ اسی بات کو یہاں پھر دہرایا ہے کہ اس کتاب کی طرف جو اُن کو بلایا جا رہا ہے تو اس لئے نہیں کہ اس میں بلانے والے کا کوئی فائدہ ہے بلکہ سرتاسر اُنہی کا فائدہ ہے۔ اُن کو اس لئے بلایا جا رہا ہے کہ خدا کی شریعت میں انہوں نے جو اختلافات پیدا کر دیئے ہیں وہ رفع ہوں اور جو ہدایت انہوں نے گم کر دی تھی اس سے پھر بہرہ مند ہوں۔

'ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ' 'ثُمَّ' یہاں استعجاب کے مفہوم میں ہے اور 'فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ' سے مقصود یہ ظاہر کرنا نہیں ہے کہ اہل کتاب کا ایک قلیل گروہ اس کتاب الٰہی سے منہ موڑ رہا ہے، اس لئے کہ اس جرم کے مرتکب تو اہل کتاب من حیث الجماعت ہوئے تھے، ان کے اندر سے صرف تھوڑے سے لوگ نکلے، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، جو اسلام لانے والے بنے، بلکہ اس میں اصل زور 'مِنْهُمْ' کے لفظ پر ہے یعنی تعجب کا اظہار اس بات پر ہے کہ یہ منہ موڑنے والا گروہ ان اہل کتاب کا ہے جو سب سے زیادہ سزاوار اس بات کے تھے کہ سب سے پہلے اس پر ایمان لانے والے بنتے لیکن وہ ایمان کی راہ میں سبقت کرنے کے بجائے کفر کی راہ میں سبقت کرنے والے بنے۔

آخر میں 'وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ' سے اہل کتاب کے اصل جماعتی مزاج پر روشنی ڈال دی کہ حق سے اُن کا یہ اعراض کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے ان کی روش یہی رہی ہے۔ اس فقرے میں اہل کتاب کے لئے سخت ملامت کا پہلو بھی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسکین و تسلی کا بھی۔ مطلب یہ ہے کہ حق سے اعراض جن کی فطرت ثانیہ اور جن کا قومی مزاج بن چکا ہو اُن کے دل میں اگر حق نہیں اُترتا تو اس میں قصور تمہارا یا حق کا نہیں ہے بلکہ اُن کے فساد مزاج

کا ہے۔ پتھر میں جونک کہاں لگی ہے!

جو لوگ بنی اسرائیل کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ سے لے کر سیدنا مسیحؑ تک بلا استثنا ہر پیغمبر نے ان کے مزاج پر ماتم کیا ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم انبیائے بنی اسرائیل کے صحیفوں سے اس کی مثالیں پیش کرتے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۠ وَغَرَّھُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۲۴

یہ مضمون سورہ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کے ہر پہلو کی وضاحت کر چکے ہیں. وہاں ارشاد ہوا ہے کہ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـــــَٔــتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ ۸۰-۸۱ بقرہ (اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن، ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے عہد کرا لیا ہے تو اللہ اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایک تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے میں تمہارے پاس کوئی علم نہیں۔ اصل معاملہ تو یوں ہے کہ جس نے گناہ کی کمائی کی اور اس کے اس گناہ نے اس کو اپنے لپیٹ میں لے لیا تو یہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)۔

یہودی کی جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال

بقرہ میں یہ آیت بنی اسرائیل کی ان جھوٹی آرزوؤں (امانی) کے ضمن میں وارد ہے جن کو کوئی سند ان کے دین میں موجود نہیں تھی، ان کے علماء نے محض اپنے جی سے گھڑ کر ان کو اپنی شریعت کا جزو بنا دیا تھا اور دل پسند ہونے کی وجہ سے یہ بدعتیں ان کے عوام کے دلوں میں اس طرح راسخ ہو گئی تھیں کہ اب ان کا سارا تکیہ انہی جھوٹی آرزوؤں پر رہ گیا تھا۔ از انجملہ ان کا یہ من گھڑت عقیدہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل چونکہ برگزیدہ اُمّت ہیں اس وجہ سے ان کے اعمال خواہ کچھ بھی ہوں لیکن ان کیلئے دائمی عذاب نار نہیں ہے۔ اوّل تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے گئے بھی تو بس تھوڑی بہت اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر چھوٹ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ ایجاد کر لینے کے بعد دین کی اصلی ذمّہ داریوں کو سوچنے سمجھنے کی ان کو کیا ضرورت

ی باقی نہیں رہ گئی تھی تو پھر وہ اس قرآن کی طرف کیوں توجہ کرتے جو ان کو اس جنت الحمقا سے نکال
کر رو در رو ان کی ان ذمہ داریوں کے آگے کھڑا کرنا چاہتا تھا جو ان پر فی الواقع ان کے دین کی
رو سے عاید ہوتی تھیں - قرآن نے واضح کیا کہ ان کا یہ عقیدہ 'افتراء علی اللہ' یعنی اللہ تعالیٰ کے
اوپر ایک تہمت اور ایک بہتان ہے - اس نے کہیں بھی بنی اسرائیل کو یہ لائسنس نہیں دیا ہے کہ
وہ جو چاہیں کرتے رہیں، بس چند دن کی سزا کے بعد وہ جنت میں پہنچ جائیں گے - ساتھ ہی یہ بھی فرمایا
کہ درحقیقت ان کی اسی قسم کی من گھڑت بدعات و خرافات ہیں جن میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے
وہ اپنے دین کے معاملے میں دھوکے میں پڑے ہیں - اب ان کا دین ان کی چند دل پسند آرزوؤں
اور ان کے چند دلفریب خوابوں کا ایک مجموعہ بن کر رہ گیا ہے جن میں ان کے لئے خدا کے ہاں حقوق
تو بے شمار ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر لیکن یہ ان کے اوپر چند رسوم کے سوا کوئی ذمہ داری عاید
نہیں کرتا -

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا
يُظْلَمُونَ ۝ ۲۵

یعنی یہ تو یہ اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں اور آخرت سے متعلق یہ لذیذ خواب دیکھ رہے ہیں لیکن
اس وقت کیا بنے گا جب ہم اُن کو ایک ایسے یوم الفصل کے احوال و نتائج دیکھنے کے لئے
جمع کریں گے جو اس کائنات کی ایک اٹل حقیقت ہے اور جس کے پیش آنے میں کسی شک و شبہ
کی گنجائش نہیں ہے؟ ہمارے نزدیک لام یہاں 'فی' کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ
اس کے اندر ظرفیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے، اور عربی زبان کے قواعد کی رو سے اس بات کی بھی
گنجائش ہے کہ یہاں حرف جر کے بعد ایک مضاف محذوف مان لیا جائے - ہم نے اسی دوسرے
پہلو کو سامنے رکھ کر آیت کی وضاحت کی ہے -

اس دن کی ایک خصوصیت تو یہ بیان ہوئی کہ اس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے
دوسری یہ کہ اس دن ہر نفس کو اس کی کمائی پوری کی جائے گی، کسی کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائیگی -
مطلب یہ ہے کہ اب یہ اہلِ کتاب خود سوچ لیں کہ آج ایک من گھڑت عقیدے میں مبتلا ہو کر یہ جس
بے خوشی کے مزے لے رہے ہیں اس سے بیدار ہونے کے بعد انہیں کس حقیقت سے دوچار ہونا ہے -

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ ۲۶-۲۷-

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطے سے اُمت کو ایک دُعا تلقین کی گئی ہے جو مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہے۔

ایک عظیم بشارت دعا کے امور ثلاثہ

۱- پہلی چیز وہ عظیم بشارت ہے جو اس امت کے لئے اس کے اندر مضمر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ دُعا در پردہ اشارہ کر رہی ہے کہ اہل کتاب کی ضد اور ان کے حسد کے علی الرغم امامت و سیادت کا وہ منصب جس پر بنی اسرائیل اب تک فائز رہے ہیں اب وہ بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو رہا ہے اور بنی اسرائیل کی کوئی مخالفت خُدا کے اس فیصلہ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اپنے ملک کا مالک خُدا ہے، جس کو چاہے وُہ ملک بخشے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلت دے، خیر کے تمام خزانوں کا مالک وہی ہے۔ بنی اسرائیل جو یہ سمجھتے رہے ہیں کہ تمام خیر کے وارث و مورث وہی ہیں کسی اور کے لئے اخاص کر بنی اسمٰعیل کے لئے اس خیر میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس دُعا نے ان کے اس خیال باطل کی بساط الٹ دی۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اب مالکِ کائنات نے اس خزانۂ خیر کی کنجیاں بدعہدوں اور خائنوں سے چھین کر ان کے حوالہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جو اس امانت کے اہل ہیں۔

۲- اس بشارت کے ساتھ اس میں بنی اسرائیل کے لئے انذار بھی ہے اور یہ انذار درحقیقت مذکورہ بالا بشارت ہی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب سیادت بنی اسمٰعیل کو حاصل ہو گی تو لازماً اس سیادت سے بنی اسرائیل محروم ہوں گے، جب بنی اسمٰعیل عزت سے سرفراز ہوں گے تو لازماً بنی اسرائیل کے لئے ذلت مقدر ہو چکی ہے۔ نصب و عزل، عزت و ذلت اور حیات و موت دونوں کا ذکر کر کے قرآن نے اپنے مخالفین اور موافقین دونوں کے لئے تقدیر کا فیصلہ سنا دیا۔

۳- اس میں اس امت کے لئے ایک عظیم نصیحت بھی ہے کہ اب یہ امانت جو تمہاری طرف منتقل ہو رہی ہے تو یہود کی طرح یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ یہ تمہارے استحقاق ذاتی کا کرشمہ یا تمہارے حسب و نسب کا

ثمرہ ہے بلکہ یہ سرتاسر خدا کا فضل ہے جس کے تم اسی وقت تک سزاوار قرار پاؤ گے جب تک اس کا حق ادا کرتے اور اس کی ذمہ داریوں کو اُٹھانے کے معاملے میں برابر خدا سے دعا کرتے رہو گے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ آیت درحقیقت یہود کے عزل کا اعلان اور امتِ مسلمہ کے نصب کی بشارت ہے لیکن بات بجائے خبر اور بشارت کے دعا کے اسلوب میں کہی گئی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان آیات کے نزول کے وقت تک حالات ابھی پردے میں تھے اور جو چیز پردے میں ہو اس کے متعلق یہی اسلوب موزوں ہے کہ اُمت اس کے لئے دعا کرے۔ دوسری یہ کہ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ امت اس بشارت کو فخر اور غرور کے ساتھ نہ قبول کرے بلکہ تواضع، تذلل، احساسِ عبدیت اور دعا کے ساتھ قبول کرے اس لئے کہ سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جو محروم ہوتا ہے وہ بھی خدا ہی کے حکم سے محروم ہوتا ہے اور جو پاتا ہے وہ بھی خدا ہی کے ہاتھ سے پاتا ہے۔

بشارت کے دعائیہ اسلوب میں ظاہر ہونے کی بعض اور نہایت بلیغ مثالیں بھی قرآن میں موجود ہیں، مثلاً ہجرت کے حکم سے ذرا پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھائی گئی۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا ۝ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۔	اور دعا کرو کہ اے رب مجھے داخل کر عزت کے ساتھ اور مجھے نکال عزت کیساتھ اور مجھے خاص اپنے پاس سے نصرت کا پروانہ عطا فرما۔ اور یہ اعلان کر دو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہوا اور باطل نابود ہونے ہی کے لئے ہے۔

(۸۰-۸۱ بنی اسرائیل)

اس دعا میں ہجرت کی خبر بھی ہے اور ساتھ ہی اس بات کی بشارت بھی کہ آپؐ کا مکہ سے نکلنا اور دار الہجرت میں داخل ہونا دونوں عزت کے ساتھ ہوگا اور آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کے لئے خاص بدرقہ اور نصرت کا خاص پروانہ عطا ہوگا بلکہ اس میں ایک لطیف بشارت اس بات کی بھی ہے کہ آپ کے پُروقار داخلہ کا انتظام آپ کے نکلنے سے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اس کا اشارہ اس بات سے ہو رہا ہے کہ دعا میں داخل ہونے کا ذکر نکلنے کے ذکر پر مقدم رکھا گیا ہے بلکہ زیادہ تدبر سے کام لیجئے تو یہ بات بھی آیت سے نکلتی ہے کہ ہجرت درحقیقت فتح کا دیباچہ ہے

غلبہ حق کا مقدر ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کو خبر اور بشارت کے اسلوب میں کہنے کے بجائے دعا کے اسلوب میں کہا گیا ہے اور اس میں حکمت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔

نظامِ تکوینی کی شہادت

'تُولِجُ النَّهَارَ' الآیہ میں اسی بات پر جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی اس کائنات کے نظامِ تکوینی کی شہادت کا حوالہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو خدا رات کو دن میں داخل کرتا اور رات کے بعد دن کو نمودار کرتا ہے۔ جو مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مُردہ کو ظاہر کرتا ہے اس کے سوا دنیا میں عزل و نصب اور عزت و ذلت کا اختیار ہو بھی کسے سکتا ہے!

یہ دن کو رات میں داخل کرنا اور رات کو دن میں داخل کرنا رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کے آمد و شد کی نہایت خوبصورت تشبیہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے دونوں ایک دوسرے کا پوری سرگرمی سے تعاقب کر رہے ہیں۔ کبھی رات دن کے اندر گھس جاتی ہے، کبھی دن رات کے اندر چھپ جاتا ہے، یہ چکر پورے تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے۔ قرآن میں یہ تشبیہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے ظاہر ہونے کے نشانات بھی ہر گوشے میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں، مادیات میں بھی معنویات میں بھی۔ یہ ایک لطیف تعریض اس صورت حال پر بھی ہے جو بنی اسرائیل کی موت اور بنی اسمٰعیلؑ کی زندگی سے نمایاں ہو رہی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے جو پودا فلسطین کی سرسبز و شاداب زمین میں لگایا تھا اب وہ سوکھ چکا تھا اور جیسا کہ حضرت یحییٰؑ نے فرمایا اس کی جڑ پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا۔ اس کے برعکس انہوں نے جو پودا عرب کی خشک اور بنجر زمین میں لگایا تھا اور جو مرجھایا ہوا پڑا تھا اب اس میں شگوفے نکل رہے تھے اور جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا، وہ ایک تناور درخت بن کر ایک عالم کو اپنے سایے کی پناہ میں لینے والا تھا۔

بغیر حساب کے دو مفہوم

'وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ'۔ رزق یہاں فضل و انعام کی تعبیر ہے، روزی کے محدود مفہوم میں نہیں ہے۔ 'بِغَيْرِ حِسَابٍ' یہاں دو مفہوموں پر مشتمل ہے۔ ایک کثرت کے مفہوم پر یعنی وہ جس کو چاہتا ہے بے اندازہ فضل و انعام سے نوازتا ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ جیسا کہ فرمایا ہے وَاِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (صابروں کو ان کے صبر کا بے حساب اجر ملے گا)، دوسرے بے سان و گمان کے مفہوم پر۔ جیسا کہ فرمایا ہے وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۶۵ - طلاق (اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا)

۹۔ آگے کا مضمون آیات ۲۸-۳۲

اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اب اہل کتاب کی حیثیت ایک اُجڑے ہوئے گھر کی ہے جس کا ڈھے جانا مقدر ہو چکا ہے اس وجہ سے آگے کی آیات میں ان کمزور اور مبتلائے نفاق مسلمانوں کو جو اہلِ کتاب بالخصوص یہود کی طرف میلان رکھتے تھے متنبہ فرمایا کہ اب ان سے موالات رکھنا ایک اُجڑے ہوئے گھر کی دربانی ہے اور اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جب وہ گھر گرے تو اس کے نیچے وہ لوگ بھی دب کے رہ جائیں جو آج اس کی دیواروں کے نیچے سائے کی تلاش میں گئے ہیں۔

اس کے بعد ان کے اس نفاق پر تنبیہ فرمائی کہ اگر ان کے دلوں میں کفر اور اہل کفر کی محبت چھپی ہوئی ہے تو وہ یہ یاد رکھیں کہ خدا سے کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے ، ایک دن آئے گا جب ہر شخص کے سامنے اس کا سارا کھلا چھپا آجائے گا اس دن خدا کا عدل ظاہر ہوگا اور ہر شخص اس کا مزا چکھے گا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہے اس وجہ سے وہ پہلے سے اس دن سے آگاہ کر رہا ہے۔

پھر ایمان اور محبتِ الٰہی کا صحیح تقاضا واضح فرمایا کہ جو لوگ اللہ پر ایمان اور اُس کی محبت کے مدعی ہوں ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے مخالفوں سے موالات رکھیں بلکہ ان کے لئے صحیح روش یہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی پیروی کریں ، جو لوگ ایسا کریں گے خُدا بھی ان سے محبت کرے گا۔ یہی راہ خدا کے محبوب بننے کی راہ ہے۔ جو لوگ اس کے خلاف روش اختیار کریں گے وہ درحقیقت کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں رکھتا۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸-۳۲ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ
فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ
الْمَصِيْرُ ۲۸ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۲۹ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ
مُّحْضَرًا ۚ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ

اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰ
وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَ
فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: اہل ایمان مومنوں کے برخلاف کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کریں گے تو اللہ سے ان کو کوئی تعلق نہیں، مگر یہ کہ تم اُن سے بچو جیسا بچنے کا حق ہے، اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈر ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو چھپاؤ یا ظاہر کر اللہ اس سے باخبر ہے اور وہ اس سب کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے ا اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس دن ہر جان اپنی کی ہوئی نیکی کو اپنے سامنے موجود پائے گی اور ج برائی کی ہوگی اس کو بھی موجود پائے گی اور وہ آرزو کرے گی کہ کاش اُس کے اور اس کے درمی ایک زمانۂ دراز حائل ہوتا اور اللہ اپنی ذات سے تمہیں ہوشیار کرتا ہے، اللہ اپنے بندوں ساتھ بڑا مہربان ہے۔ ۲۸-۳۰؛

کہہ دو، اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا تمہارے گناہوں کو بخشے گا، اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت ک اور رسُول کی، اگر یہ اعراض کریں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۳۱-۳۲؛

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ
فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَیُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِ
اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾

[illegible]

"مُؤْمِنُوْنَ" کا لفظ اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن مراد اس سے خاص طور پر وہ مسلمان جو ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوئے تھے بلکہ کچھ اپنے ذاتی مصالح کی وجہ سے اور کچھ اسلام کے کے بارے میں، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، غیر مطمئن ہونے کے باعث، یہود کی طرف میلان تھے، اور یہود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں کرتے تھے اس میں وہ ان کو آلۂ کا

لیتے تھے اور یہ ان کے آلہ کار بن جاتے تھے۔ ان کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اب یہود کے ساتھ موالات اور دوستی اُجڑے گھر کی دربانی بھی ہے اور یہ حرکت ایمان و اسلام کے دعوے کے منافی بھی ہے۔

"کَافِرِیْنَ" سے یہاں مُراد اہل کتاب خاص طور پر یہود ہیں جیسا کہ آیت ۲۱ میں اُن کے کفر کی تصریح گزر چکی ہے۔

'ولی' کے معنی کارساز، حمایتی، ساتھی، دوست اور مددگار کے ہیں۔ جس کی طرف ضرورت کے وقت رجوع کیا جائے اور جس کا حمیت و حمایت کے جذبے سے ساتھ دیا جائے۔ فرمایا کہ مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ کافروں کو اپنا ولی بنائیں لیکن اس کے ساتھ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ کی قید ہے یعنی کافروں کے ساتھ صرف اس قسم کی موالات ناجائز ہے جو مسلمانوں کے بالمقابل یا ان کے مفاد و مصالح کے خلاف ہو۔ اسلام اور مسلمانوں کا حق اور مفاد دوسرے تمام حقوق و مفادات پر مقدم ہے اس لئے مسلمانوں کی کسی جماعت کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح کے برخلاف کفّار کی کسی جماعت کے ساتھ موالات کا تعلق قائم کرے۔ اس قید نے یہ بات واضح کر دی کہ غیر حربی کفار کے ساتھ اس نیکی، عدل اور احسان کی ممانعت نہیں ہے جس کی اسلام نے تمام بنی نوع انسان کے معاملے میں ہدایت فرمائی ہے۔ مسلمان غیر مسلم قوموں اور حکومتوں کے ساتھ دوستانہ سیاسی و اقتصادی معاہدے بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ نہ ہوں۔ اس مسئلے پر تفصیلی بحث ہم آگے موزوں مقام پر کریں گے۔

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (مگر یہ کہ ان سے بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے) 'تُقٰىةً' جس طرح اسی سورہ کی آیت ۱۰۲ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ میں مفعول مطلق کے طور پر استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں بھی مفعول مطلق ہے جس سے فعل کی تاکید ظاہر ہو رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کفّار سے موالات کا تعلق رکھتے ہیں ان کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس قسم کے لوگ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے "ومن یتولھم منکم فانہ منھم" انہی لوگوں کے اندر شامل ہیں جن سے یہ موالات رکھتے ہیں۔ اللہ اور اعداء اللہ دونوں کے ساتھ بیک وقت دوستی قائم نہیں رکھی جا سکتی: اللہ سے دوستی کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں

سے اپنا دامن بچا کے رکھو جو اللہ کے، اس کے دین کے اور اس کے وفادار بندوں کے دشمن ہیں۔ۘ یہ جملہ گویا لَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ سے استثنا ہے یعنی اس نفی سے مستثنیٰ صرف وہی ہیں جو ان کفار کی مخالف اسلام موالات سے اس طرح بچیں جس طرح اس سے بچنے کا حق ہے۔

اس آیت سے جن لوگوں نے تقیہ کا جواز نکالا ہے انھوں نے لغت، نظائر قرآن اور سیاق و سباق ہر چیز کو نظر انداز کیا ہے لیکن صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اب اُس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ہوشیار کرتا ہے) میں منافقین کے لئے تنبیہ کا ایک خاص پہلو ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کی کریمی سے دھوکے میں پڑ کے اس کی ذات کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز نہ کر جاؤ۔ وہ اگر شرارتوں سے درگزر کرتا ہے، سازشوں کو نظر انداز کرتا ہے اور ریشہ دوانیوں کا فوراً نوٹس نہیں لیتا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ جرائم اس کے نزدیک جرائم نہیں یا وہ اُن جرائم پر گرفت نہیں کر سکتا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بندوں کو آخری حد تک مہلت دیتا ہے۔ یہ مہلت بہرحال مہلت ہے جو ایک دن ختم ہونی ہے۔ اس کے بعد اس کا عدل ظہور میں آئے گا اور یہ عدل بھی اس کی ذات ہی کا ایک پہلو ہے۔ یہ اگر ابھی ظہور میں نہیں آیا ہے تو اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ ظہور میں آئے گا ہی نہیں۔ خدا کے کاموں میں دیر ہے اندھیر نہیں، جب اُس کی ذات کا یہ پہلو سامنے آئے گا تو ہر شخص پر کھل جائے گا کہ اس سے زیادہ زور آور، اس سے زیادہ بے لاگ اور اس سے بڑا منتقم و قہار کوئی بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے اسی پہلو سے یہاں ہوشیار کیا ہے اور آگے واضح ہوگا کہ بار بار ہوشیار کیا ہے۔ ایک دوسری جگہ فرمایا ہے۔ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (اے انسان تجھ کو تیرے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے) اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

(نفس کے معنی یہاں ذات خاص ہیں)

جن کمزور اور منافق قسم کے مسلمانوں کو یہاں تنبیہ فرمائی ہے انہی کا ذکر اسی سورہ میں آگے

ۘ اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت بھی پیش نظر رہے۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۲۲ مجادلہ (تم کوئی ایسی قوم نہیں پا سکتے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہو، پھر وہ اُن لوگوں سے دوستی رکھے جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے ہیں)۔

بھی آرہا ہے۔ اس سے اس آیت کے بعض مخفی گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۖ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۚ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۖ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۖ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ (آل عمران ۱۱۸-۱۲۰)	اے ایمان والو، اپنے سے باہر والوں کو اپنا محرم راز نہ بناؤ، وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے وہ تمہارے لئے زحمتوں کے آرزومند ہیں، ان کی زبانوں سے ان کی دشمنی آشکارا ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی شدید ہے۔ ہم نے تمہاں واضح تنبیہات پہنچادی ہیں، اگر تم سمجھنے والے لوگ ہو۔ تمہی ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو، وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم پوری کتاب پر ایمان رکھتے ہو۔ اور جب وہ تمہارے سامنے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب وہ الگ ہوتے ہیں تو غصے سے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں، کہہ دو کہ تم اپنے اس غصے میں مر جاؤ، اللہ دلوں کے بھیدوں سے باخبر ہے۔ اگر تمہیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو انہیں بری لگتی ہے اور اگر کوئی گزند تمہیں پہنچ جاتی ہے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم ثابت قدم اور تقویٰ پر قائم رہے تو ان کی چالوں سے تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا، اللہ ان کے اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۝

'مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ' میں اشارہ ہے اس نفاق اور اہلِ کفر کی دوستی کی طرف جو یہ لوگ اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ فرمایا کہ اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو خدا سے کوئی چیز بھی چھپی نہیں ہے۔ وہ صرف تمہارے دلوں کے رازوں ہی سے نہیں بلکہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے سب سے باخبر بھی ہے اور ہر چیز پر قادر بھی ہے۔ اس علم و قدرت کے باوجود اگر وہ ڈھیل دے رہا ہے تو اس لئے کہ اس نے جزا اور سزا کے لئے ایک خاص دن مقرر کر رکھا ہے جس میں ہر ایک کے سامنے اس کی نیکی اور بدی سب آجائے گی اور ایسے نتائج کے ساتھ سامنے آئے گی کہ جو لوگ اس ڈھیل سے دھوکے میں پڑ کر اس دن کو اتنا بعید سمجھ بیٹھے کہ اس کے لئے کسی فکر و اہتمام کی ضرورت ہی سے بےنیاز ہو گئے، وہ یہ آرزوئیں کریں گے کہ کاش اُن کے اور اُن کے اِن نتائج اعمال کے درمیان ایک زمانہ بعید کی دوری حائل ہو جائے۔

'مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ' کے بعد بھی 'محضرا' کا لفظ محذوف ہے۔ چونکہ پہلے ٹکڑے میں اس کا اظہار ہو چکا ہے اس وجہ سے دوسرے میں تکرار سے بچنے کے لئے اس کو حذف کر دیا۔ 'بَیْنَھَا وَ بَیْنَهٗ' میں پہلی ضمیر کا مرجع 'نفس'، دوسری کا 'سوء محضر' ہے۔

وَ یُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ: 'رءوف' کے لفظ پر ہم کہیں بحث کر آئے ہیں کہ اس میں دفعِ شر کا پہلو غالب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہے، وہ اُن کو اُن کے اعمال کے نتائجِ بد سے بچانا چاہتا ہے اس وجہ سے وہ ان کو اپنی ذات سے بار بار ہوشیار کر رہا ہے کہ وہ اس کی ڈھیل سے کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں۔ وہ ڈھیل تو بے شک دیتا ہے لیکن جب پکڑے گا تو اس کی پکڑ بھی بڑی ہی سخت ہوگی۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ

یہ ان مذبذب قسم کے مسلمانوں کو اس صحیح رویے کی تعلیم دی گئی ہے جو سچے مسلم کی حیثیت سے انہیں اختیار کرنا چاہیئے۔ فرمایا کہ اگر تم اللہ کے ساتھ محبت رکھنے کے مدعی ہو تو اس محبت کے ساتھ ان لوگوں کی محبت جمع نہیں ہو سکتی جو اللہ کے، اس کی کتاب کے اور اس کے دین کے [illegible] اگر تم رسول کی پیروی [illegible]

تو یہی راستہ اللہ سے محبت کرنے کا ہے اور اس کا انعام یہ ہے کہ اللہ بھی تم سے محبت کریگا اور اب تک تم سے جو غلطیاں اور کمزوریاں صادر ہوئی ہیں ان کو معاف فرما دے گا، اللہ غفور رحیم ہے۔

اس کے بعد نہایت واضح الفاظ اور تہدید آمیز انداز میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرا دیا کہ ان کو خبردار کر دو کہ سیدھے سیدھے اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کریں۔ اور اگر وہ اس چیز سے اعراض کرتے ہیں تو یاد رکھیں کہ وہ بھی انہی کافروں کے ساتھ شامل ہیں جن سے ان کا یارانہ ہے اور اس کے ساتھ اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو کبھی دوست نہیں رکھتا۔

ان دونوں آیتوں میں بعض باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ ان دونوں کا لب و لہجہ الگ الگ ہے۔ پہلی آیت میں شفقت ہے اور دوسری میں تنبیہ بلکہ تہدید۔ گویا درشتی و نرمی ہم در بہ است۔

دوسری یہ کہ ایمان کی اصل رُوح اللہ کی محبت ہے اور اس محبت کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی محبت جمع نہ ہونے پائے جو اس کے ضد ہو۔

تیسری یہ کہ اللہ سے محبت کرنے کا واحد راستہ رسُول کی پیروی ہے، اس سے ہٹ کر جو راستے نکالے گئے ہیں وہ سب بدعت و ضلالت ہیں۔

چوتھی یہ کہ خُدا کی محبوبیت کا راستہ بھی رسُول کی پیروی ہی ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی رسُول کی سنت سے منحرف ہو اور وہ اس زعم میں مبتلا ہو کہ وہ خدا کا محبوب ہے یا دوسرے اُس کو محبوبِ خدا سمجھیں تو یہ بالکل خبط ہے۔

پانچویں یہ کہ دین کا کم سے کم مطالبہ اللہ و رسول کی اطاعت ہے اگر کوئی شخص یہ مطالبہ پورا کرنے سے اعراض اختیار کرتا ہے تو اس کا شمار دین کے منکروں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت نہیں رکھتا۔

آگے کا مضمون ۳۳-۴۴

۱۱- آگے کا مضمون آیات (۳۳-۴۴)

آیت ۳۲ پر سورہ کی تمہید ختم ہوئی۔ اب آگے نصاریٰ کی بدعات کی تردید شروع ہو رہی ہے جو اس سورہ میں اصل مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا آغاز بھی ایک تمہید سے ہوا ہے۔

پہلے اس سلسلۂ رشد و ہدایت کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی رہنمائی کے لئے قائم فرمایا۔ اس ذیل میں حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران کا ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دُنیا کی امامت و ہدایت کے لئے منتخب فرمایا۔ اس زمرے میں آلِ عمران کا ذکر خاص طور پر سیدنا مسیحؑ کے ذکر کی گویا تمہید ہے اس لئے کہ اسی مبارک خاندان کی چشم و چراغ حضرت مریمؑ ہیں اور انہی حضرت مریمؑ کے بطن سے سیدنا مسیحؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ مقصود حضرت آدمؑ سے لے کر آلِ ابراہیمؑ و آلِ عمران کے اس شجرے کا حوالہ دینے سے یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کے متعلق نصاریٰ کے سامنے یہ بات واضح طور پر آجائے کہ ان کے اپنی مانی ہوئی تاریخ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ حضرت مسیحؑ یا اُن کی والدہ کوئی مافوق بشر ہستی ہیں بلکہ ان کا تعلق بھی رشد و ہدایت کے اسی سلسلۃ الذہب سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت کے لئے منتخب فرمایا۔ اس مبارک خانوادہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد و ہدایت کے لئے برگزیدگی کا شرف ضرور حاصل ہوا لیکن یہ برگزیدگی اللہ کی بندگی اور اس کی بندگی کی دعوت کے لئے تھی جس طرح اس سلسلہ میں دوسرے اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں اسی طرح حضرت مسیحؑ بھی خدا کے ایک برگزیدہ بندے ہیں۔ پھر ان کو اور اُن کی والدہ کو الوہیت کا درجہ دینے کا جواز کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟

آگے حضرت مریمؑ کی ابتدائی زندگی کے واقعات کا حوالہ ہے کہ ان کی ولادت سے پہلے کس طرح ان کی والدہ نے اپنے پیٹ کے بچّے کے لئے ایک منت مانی، پھر جب توقع کے خلاف اُن کے ہاں لڑکی کی ولادت ہوئی تو انہیں کس نوعیت کا اضطراب پیش آیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ اضطراب کس طرح دُور فرمایا، حضرت زکریاؑ نے ان کو کس طرح اپنی تربیت میں لیا اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی قبولیت سے نوازا یہاں تک کہ اُن کے رُوحانی فیوض و برکات سے حضرت زکریا جیسے صاحبِ فیوض و برکات بھی اس درجہ متاثر ہوئے کہ اُنھوں نے اپنے لئے بھی اولادِ صالح کی دُعا مانگی۔ حضرت مریمؑ کی اس سرگذشت کا حوالہ دینے سے مقصود نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک پاکیزہ خصائل تابعدار اور فرمانبردار بندی کی سرگذشت ہے نہ کہ ان کے زعم کے مطابق نعوذ باللہ خدا کی ماں کی!

اس کے بعد حضرت زکریاؑ کی دعا کی قبولیت کا ذکر ہے کہ باوجودیکہ وہ خود بڑھاپے کی آخری منزل میں داخل ہو چکے تھے اور ان کی بیوی بھی بانجھ تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی بشارت دی اور وہ اس بشارت کے بموجب پیدا ہوئے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خارق عادت ولادت اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک نشانی ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جس کی ولادت اسباب کے عام ضابطہ کے خلاف ہو اس کو خدا یا اوتار بنا دیا جائے۔ اگر نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کی خارق عادت ولادت کی دلیل پر ان کو خدا بنا بیٹھے تو یہ دلیل تو حضرت یحییٰؑ کے حق میں بھی موجود ہے!

اس روشنی میں اب ابطالِ نصرانیت کی اس تمہید کو پڑھیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٣٣﴾
ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾ إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ
إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا
وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ
الذَّكَرُ كَالْأُنثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا
مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٣٦﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا
زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا ۖ قَالَ يَا مَرْيَمُ
أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٧﴾ هُنَالِكَ
دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۖ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿٣٨﴾
فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ
مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿٣٩﴾ قَالَ رَبِّ
أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ ۖ قَالَ كَذَٰلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا
يَشَاءُ ﴿٤٠﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَل لِّي آيَةً ۖ قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا ۗ
وَاذْكُر رَّبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴿٤١﴾ وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ
اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ ﴿٤٢﴾ يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي

لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝۴۳ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَ
مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ
يَخْتَصِمُوْنَ ۝۴۴

اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آلِ عمران کو اہل عالم کی رہنمائی کے لئے منتخب فرمایا۔ یہ ایک دوسرے کی ذریت ہیں۔ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۳۳ - ۳۴

یاد کرو، جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ اے میرے رب جو بچہ میرے پیٹ میں ہے میں نے اس کو ہر چیز سے چھڑا کر تیرے لئے خاص کیا، سو تو اس کو میری طرف سے قبول فرما، بیشک تو ہی ہے جو سننے والا جاننے والا ہے۔ تو جب اس نے اس کو جنا تو اس نے کہا کہ اے رب یہ تو میں لڑکی جنی ہوں ـــــ اور اللہ کو خوب پتا تھا اس چیز کا جو وہ جنی تھی ـــــ اور لڑکا لڑکی کی مانند تو نہیں ہوتا، اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ تو اس کے رب نے اس کو اپنی پسندیدگی کی قبولیت سے نوازا، اس کو عمدہ طریقے پر پروان چڑھایا اور زکریا کو اس کا سرپرست بنایا۔ جب جب زکریا محراب میں اس کے پاس جاتا وہاں رزق پاتا، اس نے پوچھا اے مریم یہ چیزیں تمہیں کہاں سے حاصل ہوتی ہے۔ اس نے کہا یہ اللہ کے پاس سے ہے۔ بے شک اللہ جس کو چاہے بے حساب فضل فرماتا ہے۔ ۳۵ - ۳۷ -

اس وقت زکریا نے اپنے رب کو پکارا۔ اس نے دعا کی اے میرے پروردگار! مجھے بھی اپنی جناب سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو دعا سننے والا ہے۔ تو فرشتوں نے اس کو ندا دی جب کہ وہ محراب میں نماز میں کھڑا تھا کہ اللہ تجھ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے جو اللہ کے ایک کلمہ کے مصداق، سردار، لذاتِ دنیا سے کنارہ کش اور زمرۂ صالحین میں بنی ہوں گے۔ اس نے کہا اے میرے رب میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، میں تو بوڑھا ہو چکا اور میری بیوی بھی بانجھ ہے؟ فرمایا، اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس نے اے میرے رب تو میرے لئے کوئی نشانی ٹھہرا دے۔ فرمایا تیرے لئے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا مگر اشارے سے۔ اور اپنے رب کو بہت

یاد کیجیو اور شام صبح اسی کی تسبیح کیجیو۔ (۳۸-۴۱)

اور جب فرشتوں نے کہا اَے مریم! اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا۔ تم کو پاک کیا اور تم کو دُنیا کی عورتوں پر ترجیح دی۔ اَے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری میں لگی رہو اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے ساتھ سجدہ اور رکوع کرتی رہو۔ ۴۲-۴۳۔

یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تم کو وحی کر رہے ہیں، اور تم تو ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی سرپرستی کرے اور تم اس وقت بھی ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ۴۴!

۱۲۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۳۳ ذُرِّيَّةً
بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۳۴۔

حضرت مسیحؑ کے نانا

آدم، نوح اور ابراہیم (علیہم السلام) یہ سلسلۂ نبوت و رسالت کے اساطین و عمائد ہیں۔ ان کا ذکر ہو گیا تو گویا نبوت کے پورے مبارک سلسلے کا ذکر ہو گیا۔ حضرت ابراہیمؑ کے ذکر کے ساتھ ان کے آل کے ذکر نے ان دونوں شاخوں کو جمع کر دیا جو ان سے پھوٹی ہیں۔ یعنی حضرت اسحٰقؑ کی شاخ کا بھی جس کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور حضرت اسمٰعیلؑ کی شاخ کا بھی جس میں خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ آلِ ابراہیم کے بعد آلِ عمران کا ذکر یہاں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اس خاندان مبارک کا ذکر ہے جس میں حضرت مریمؑ کی ولادت با سعادت ہوئی۔ عمران بن ماتان، حضرت مریمؑ کے والد ماجد کا نام ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جدّ مادری ہیں۔ اس سارے شجرے کے ذکر سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بھی اسی سلسلۂ مبارک کی ایک کڑی ہیں، ان کی والدہ، ان کے نانا اور ان کے دوسرے اجداد سب معلوم ہیں۔ یہ سارے خاندان ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ اور ایک دوسرے کی ذرّیت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پھر اسی خاندان سے اُٹھے ہوئے ایک شخص کو اُلوہیت کے مقام پر پہنچا دینے کے کیا معنی؟

"وَاللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو نبوت و رسالت کے لئے انتخاب فرمایا، یہ انتخاب تمام تر سمع و علم پر مبنی تھا، اس نے جن کو اس منصب کے لئے اہل پایا ان کو اس کے لئے انتخاب فرمایا۔ اس چیز کا انحصار تمام تر اہلیت و صلاحیت اور اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت پر ہے اس میں کسی خاندان کے شرف ذاتی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ جیسا کہ شرف نسبی کے گھمنڈ میں مبتلا ہونے والوں نے گمان کیا۔

اِذۡ قَالَتِ امۡرَاَتُ عِمۡرٰنَ رَبِّ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لَکَ مَا فِیۡ بَطۡنِیۡ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلۡ مِنِّیۡ ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۳۵﴾

حضرت مریمؑ کی ابتدائی سرگزشت

اوپر کی آیت میں آلِ عمران کا شجرہ نسب واضح کرنے کے بعد اب یہ حضرت مریمؑ کی ولادت کا ذکر فرمایا کہ جب یہ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھیں تو ان کی والدہ۔ عمران کی بیوی۔ نے منت مانی تھی کہ اس پیدا ہونے والے بچے کو اللہ تعالیٰ کے لئے نذر کر دوں گی۔ کسی بچے کو اللہ تعالیٰ کے لئے نذر کرنے کا مقصد بنی اسرائیل میں یہ ہوتا تھا کہ اس کو معبد کی خدمت کے لئے خاص کر دیا جائے گا

"مُحَرَّرًا" کے معنی ہیں آزاد کر کے۔ یعنی بڑے ہونے پر اس بچے پر گھر در اور کمانے کھلانے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی، اس کی ساری زندگی صرف بیت المقدس کی خدمت ہی کے لئے وقف ہوگی۔ آگے آ رہا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ کو توقع لڑکے کی ولادت کی تھی لیکن پیدا ہوئی لڑکی۔ یہ چیز ان کے لئے موجب تردد ہوئی کیونکہ ہیکل کی خدمت کے لئے لڑکیوں اور عورتوں کے لینے کا رواج نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کی والدہ کی نذر قبول فرمائی اور وہ ہیکل میں داخل کر لی گئیں ــــــ حضرت مریمؑ کی یہ ابتدائی سرگزشت اور آگے کے حالات کے بیان کرنے سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ جس اللہ کی بندی کی زندگی پیدا ہونے کے پہلے ہی سے خدا اور اس کے ہیکل کی خدمت اور اللہ کی عبادت و اطاعت کے لئے وقف ہو چکی تھی اور پیدا ہونے کے بعد سے دم واپسیں تک اس کے لئے وقف رہی یہ کیسی خرد باختگی ہے کہ اس کو خدا کی بندی کے بجائے نعوذ باللہ خدا کی ماں بنا دیا گیا۔

فَلَمَّا وَضَعَتۡهَا قَالَتۡ رَبِّ اِنِّیۡ وَضَعۡتُهَاۤ اُنۡثٰی ؕ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا وَضَعَتۡ ؕ وَلَیۡسَ

الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۳۶

'وَاِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰى' سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ کو جیسا کہ اوپر گزرا، توقع فرزند کے ولادت کی تھی اور اسی توقع پر انھوں نے منت مانی تھی لیکن ولادت، توقع کے خلاف، لڑکی کی ہوئی۔ اس پر انھوں نے اپنے رب کے حضور اپنے تردد کا اظہار فرمایا کہ یہ تو میں لڑکی جنی ہوں اور بہر حال وہ لڑکا جس کو میں نے نیری نذر گمان کیا تھا میرے خیال کے مطابق لڑکا تھا، یہ لڑکی اس کا بدل تو نہیں ہو سکتی لیکن اس پر بھی اگر تو یہ نذر حقیر قبول فرمائے تو یہ تیرا فضل ہی فضل ہوگا۔

'وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ' (اور اللہ خوب جانتا تھا اس چیز کو جو وہ جنی تھی) یہ حضرت مریمؑ کی والدہ کی بات کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جملہ معترضہ ہے۔ والدہ مریمؑ کا یہ کہنا کہ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰى (میں تو یہ لڑکی جنی ہوں) تو مولود سے متعلق ایک کہتری کے احساس کی غمازی کر رہا تھا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنا یہ ہدیہ بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت درجہ رافت و رحمت سے یہ واضح فرمایا کہ والدۂ مریمؑ تو مریمؑ کو ایک لڑکی ہونے کی بنا پر نہایت حقیر چیز سمجھ رہی تھیں لیکن اللہ کو خوب علم تھا کہ لڑکی کی صورت میں ان کے پیٹ سے کیسی عظیم اور بابرکت ہستی ظہور میں آئی ہے!

'وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى' یہ والدہ مریمؑ کی بات کا حصہ ہے اور اس کا مطلب وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ یعنی کہاں وہ لڑکا جو ذہن میں تھا اور کہاں یہ لڑکی جو وجود میں آئی۔ یہ اس کا بدل تو نہیں ہو سکتی تاہم تو قبول فرمائے تو تیری نوازش!

'وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ' یہ دعا والدۂ مریمؑ کی طرف سے مریمؑ اور ان کی اولاد کے لئے ایک فطری چیز ہے۔ مقصود اس ذکر سے یہ ہے کہ جس لڑکی کی ماں اپنی لڑکی اور اس کی اولاد کے لئے یہ دعا مانگتی ہے اور جس کو خدا کے حضور نذر کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اس درجہ کہتری کا احساس اس کے اندر پیدا ہوتا ہے اسی کو نصاریٰ بعد میں خدا کی ماں کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ قرآن کا مقصد اس ساری

سرگزشت کے پیش کرنے سے یہی ہے کہ واقعات کی اصل نوعیت سامنے لاکر وہ لوگوں کو دکھائے کہ کس طرح سیدھے سادے واقعات کو ایک افسانہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّأَنۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا ۖ قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

حضرت مریم کا روحانی فضل و کمال

فَتَقَبَّلَهَا الایہ یعنی والدہ مریمؑ کو ان کے لڑکی ہونے کی بنا پر جو احساس تھا اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے اپنے حسنِ قبولیت سے ان کو نوازا، ان کی تمام عقلی، اخلاقی، روحانی صلاحیتیں خوب پروان چڑھیں۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فضل ہوا کہ ان کی کفالت و تربیت کی ذمہ داری حضرت زکریا نے اٹھائی جو حضرت مریمؑ کے خالو بھی تھے اور اس دور میں بیت المقدس کے اسرائیلی اصطلاح میں، کاہنِ اعظم بھی۔

'كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا' محراب سے مراد یا تو معبد کا وہ حصہ ہو جو عورتوں کی عبادت اور اعتکاف کے لئے مخصوص تھا یا کوئی خاص گوشۂ حجرہ جو حضرت مریمؑ کے لئے خاص کیا گیا ہو۔ بیت المقدس میں اس طرح کے حجرے اور گوشے عبادت گزاروں کے لئے بنے ہوئے تھے۔ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ سے بیک وقت دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت زکریا حضرت مریمؑ کی دیکھ بھال کے لئے اکثر ان کے پاس جاتے رہتے تھے، دوسری یہ کہ حضرت مریمؑ اپنا سارا وقت محراب میں ذکر و عبادت ہی گزارتی تھیں۔

'وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا' سے حضرت مریمؑ کے غیر معمولی روحانی کمال کا اظہار ہو رہا ہے کہ حضرت زکریا جیسے صاحبِ کمال بھی ان کے پاس جاتے تو ان کے کمالِ روحانی کے لطفات محسوس کرتے یہاں تک کہ ایک روز وہ استعجاب و تحسین کے طور پر یہ بھی پوچھ بیٹھے کہ اے مریمؑ! یہ چیزیں تمہیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں!

'رزق' سے مراد یہاں حکمت و معرفت ہے۔ قرآن نے وحی و ہدایت کے لئے یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال کیا ہے۔ تورات اور انجیل میں بھی یہ تعبیر موجود ہے۔ حضرت مسیحؑ کا

ارشاد مشہور ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمے سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔ آگے والی آیت میں آرہا ہے کہ حضرت زکریا حضرت مریمؑ کی علم و معرفت کی باتوں سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے پیرانہ سالی میں، بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود، اپنے لئے بھی ایسی ہی اولادِ صالح کی دعا مانگی ــــ ظاہر ہے کہ حضرت زکریا جیسے صاحبِ معرفت کو سیب و انگور والا رزق اس درجہ متاثر نہیں کر سکتا تھا کہ وہ یہ کرشمہ دیکھ کر اولاد کی دعا شروع کر دیں۔ اس طرح کی باتیں اربابِ کمال کے ہاں کوئی خاص درجہ و مرتبہ نہیں رکھتی ہیں۔ حضرت زکریا جیسے صاحبِ کمال تو متاثر ہو سکتے تھے تو کسی ایسے ہی رزقِ روحانی سے متاثر ہو سکتے تھے جو خود ان کی اشتہائے روحانی کو بھی بھڑکا دے، جس کو دیکھ کر وہ بھی عش عش کر اٹھیں اور جو اُن کے اندر بھی یہ تمنا پیدا کر دے کہ کاش ان کی نسل سے بھی کوئی اس کمال کا حامل اُٹھے۔

'اَنّٰى لَكِ هٰذَا' (یہ چیز تمہیں کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟) بغرضِ استفسار و تحقیق کے نہیں بلکہ بطورِ استعجاب و تحسین کے ہے۔ جب کسی کا کمال اس کی عمر کے اعتبار سے بہت زیادہ اور متکلم کے گمان و خیال سے بہت بڑھ کر ہو تو اس طرح کا استعجاب قدرتی ہے۔ یہ استعجاب اظہارِ تحسین کا ایک اسلوب ہے۔ اس سے حضرت زکریا کی تواضع اور قدردانی کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ اپنی ایک زیرِ تربیت لڑکی کو، جس کی عمر ابھی کچھ بھی نہیں ہے، اس کی صلاحیتوں پر کس فیاضی سے داد دے رہے ہیں۔ حضرت مریمؑ کا جواب 'هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ' بھی اس کمسنی ہی ان کی پختگی عقل کا شاہد ہے کہ انہوں نے اس سب کو اللہ کا فضل و احسان قرار دیا، اس کو اپنے زہد و ریاضت کا کرشمہ نہیں قرار دیا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ' ہمارے نزدیک حضرت مریمؑ کے جواب کا حصہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت مریمؑ کی تحسین اور اپنے فضلِ بے پایاں کا اظہار ہے۔ 'بِغَيْرِ حِسَابٍ' کا مفہوم ہم اوپر واضح کر آئے ہیں۔

حضرت زکریا کی ایمان افروز دعا

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝ ۳۸

'هُنَالِكَ' سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ حضرت مریمؑ کی حیرت انگیز حکمت و معرفت

سے حضرت زکریا اس درجہ متاثر ہوئے کہ اولاد کی آرزو جو ان کے اندر دبی ہوئی تھی وہ دفعۃً بھڑک اٹھی کہ کاش حکمت و معرفت کا کوئی ایسا ہی وارث اللہ تعالیٰ انکو بھی بخشے۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ من لدنک کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اپنے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کی وجہ سے ظاہری حالات کو تو وہ غیر مساعد پا رہے تھے لیکن اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھتے تھے کہ وہ اگر چاہے تو اُس کے فضل و قدرت سے ایک بوڑھے کی تمنا بھی برآسکتی ہے اور ایک بڑھیا بانجھ کی گود بھی ہری ہو سکتی ہے اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں اصل چیز تو خدا کی قدرت اور اس کی عنایت ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۳۹

مَلٰٓئِكَةُ کا لفظ یہاں اور خاص اس سیاق میں جہاں جہاں بھی آیا ہے جمع کی صورت میں آیا ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ حضرت زکریا نے ہاتف غیبی کی ندا سُنی، تعین کے ساتھ انہوں نے فرشتے کو نہیں پہچانا، اس ابہام کے سبب سے قرآن نے کسی خاص فرشتہ کے بجائے فرشتوں کا ذکر فرمایا ہے جس سے یہ بات تو نکلتی ہے کہ زکریا کو جو آواز سنائی دی وہ ملکوتی تھی لیکن ساتھ ہی اس بات کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ یہ محض ایک غیبی آواز تھی جو ان کے کانوں میں پڑی۔

وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ یعنی ہاتف غیبی کی یہ آواز اُنہیں اس وقت سنائی دی جب وہ حجرے کے اندر نماز میں کھڑے تھے۔ یہ ایک قرینہ تھا اس بات کا کہ یہ آواز ملکوتی ہی ہوگی اس لئے کہ نماز کی حالت فرشتے کے قرب و اتصال کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ ایک اور اشارہ اس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ دعا و مناجات اور اپنے رب سے راز و نیاز کے لئے سب سے زیادہ موزوں وقت وہ ہوتا ہے جب بندہ نماز میں ہوتا ہے۔ اس نماز میں زندگی اور حرارت پیدا ہوتی ہے اور یہی نماز ہماری زندگی کا ربط براہ راست ہمارے خالق و مالک سے قائم کرتی ہے۔ قرآن میں تمام مشکلات و مسائل کے اندر نماز کی جو تاکید پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کی جاتی ہے اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ زندگی کی مشکلات کے حل کی کلید اسی کے اندر ہے۔ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی نمازوں کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نمازیں فی الواقع خدا سے راز و نیاز کی نمازیں تھیں

ان کی تمام دعائیں اور فریادیں نماز کے سجدوں اور قیام میں ہوتی تھیں اور وہ اپنی نمازوں سے جب لوٹتے تھے تو اپنے دامن اور اپنی جھولیاں بھر کے لوٹتے تھے۔ ان کے لئے نماز زندگی کی ایک ایسی ہی ضرورت تھی جس طرح پیاسوں کو گھاٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری نمازوں کے اندر یہ شان باقی نہیں ہے۔ اب نمازیں صرف رسم داری کی نوعیت کی چیز بن کر رہ گئی ہیں زندگی سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے۔ اب ہم نمازیں تو بے جان اور بے رُوح پڑھتے ہیں اور لمبی لمبی دعائیں نمازوں سے فارغ ہو کر مانگتے ہیں، حالانکہ مانگنے کا اصل وقت نمازوں میں ہوتا ہے جب کہ بندہ اپنے رب کے حضور میں ہوتا ہے۔

'اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى الایۃ' یہ وہی حضرت یحییٰؑ ہیں جن کا نام انجیلوں میں یوحنا آیا ہے۔ انجیلوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰؑ سے صرف چھ ماہ پہلے پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ان کی تین خصوصیات بیان کی گئی تھیں۔

ایک یہ کہ وہ 'مُصَدِّقًاۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ' ہوں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ کی تصدیق کریں گے اور اس کی بشارت دیں گے۔ 'كَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ' سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ چنانچہ آگے آیت ۴۵ میں تصریح کے ساتھ ان کا ذکر اسی لقب سے ہوا ہے يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۴۵-آل عمران (اے مریم اللہ تم کو اپنے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے جس کا نام عیسیٰ ابن مریم ہوگا) حضرت مسیح کو کلمۃ اللہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ولادت اسباب کے عام ضابطہ کے خلاف اللہ تعالیٰ کے کلمہ 'کن' سے ہوئی۔ 'کلمۃ' کی تنکیر سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان گنت [کلم]ات میں سے حضرت عیسیٰ بھی ایک کلمہ ہیں جس طرح اس کائنات کی بے شمار چیزیں مجرد کلمہ [ک]ن سے ظہور میں آئی ہیں اسی طرح حضرت عیسیٰؑ بھی اس کلمہ سے ظہور میں آئے ہیں۔ اس سے [نصا]ریٰ کے ایک دعوے کی تردید ہو رہی ہے۔ وہ یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ کلمۃ اللہ صرف حضرت [مسی]ح ہیں اور پھر اس سے ان کی الوہیت کا عقیدہ ثابت کرتے ہیں۔

'بِكَلِمَةٍ' کی 'ب' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں تصدیق کا لفظ بشارت کے مفہوم [پر م]شتمل ہے۔ یعنی حضرت یحییٰؑ حضرت عیسیٰؑ کی تصدیق بھی کریں گے اور ان کی بشارت بھی دیں گے۔

انجیلوں سے ثابت ہے کہ انہوں نے یہ دونوں فرض انجام دیئے۔ انہوں نے خود اپنی زندگی کا جو مشن واضح کیا وہ یہی تھا کہ وہ آنے والے کی راہ صاف کرنے آئے ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنے اس مشن کی تکمیل کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ ان کی زندگی سراپا سیدنا مسیحؑ کی تصدیق تھی، ان کی ولادت بھی سمجھئے کہ ایک پہلو سے حضرت مسیحؑ کی ولادت کی طرح خارق عادت ہی تھی، زہد و توکل اور تجرد میں بھی ہو بہو اپنے بعد آنے والے کا نقش اوّل تھے اور منادی تو انہوں نے جس شان سے حضرت عیسیٰؑ کی کی ہے واقعہ یہ ہے کہ اس سے دشت و جبل گونج اُٹھے۔

دوسری یہ کہ وہ "سید" ہوں گے۔ سید کے معنی سردار کے ہیں۔ نبی اپنی فطرت، اپنی دعوت اور اپنے مشن کے لحاظ سے سردار ہوتا ہے۔ وہ داعی بن کر لوگوں کو پکارتا، منذر بن کر لوگوں کو جگاتا اور ہادی و مرشد بن کر لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کام کے لئے وہ قدرت کی طرف سے تمام لوازم و اسلحہ سے مسلح ہوتا ہے۔ اس کا سینہ خلق کے لئے شفقت و رافت سے لبریز ہوتا ہے، اس کے کلام میں بے پناہ سطوت و جلالت ہوتی ہے، اسکی آواز اور اس کے انداز میں ہیبت ہوتی ہے، اس کی تابناک پیشانی اس کی عظمت و صداقت کی گواہی دیتی ہے۔ اگرچہ وہ کمل کی پوشاک پہنتا ہو اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں پر گزارہ کرتا ہو لیکن اس کے رعب و دبدبہ سے بادشاہوں پر لرزہ طاری ہوتا ہے[1]۔ وہ حق کے لئے ان کو بھی اسی طرح سرزنش کرتا ہے جس طرح دوسروں کو کرتا ہے۔ انجیلوں میں حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں حضرات کے متعلق آتا ہے کہ وہ "با اختیار" کی طرح بات کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے کلام میں بااختیاری کی یہ شان ان کی اسی منصبی سرداری ہی کا ایک جلوہ تھی۔ اس کی تحویل میں قدرت کی طرف سے ایک گلہ بھی ہوتا ہے جس کی چرواہی اس کے سپرد کی جاتی ہے اور اس بات سے اس کی حیثیت عرفی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ گلے نے اس کی اطاعت کی یا نہیں کی۔ اگر اس نے اپنا فرض ادا کیا تو اس نے سرداری کا حق ادا کر دیا اور یہی اس سے مطلوب ہوتا ہے۔

---

[1] انجیل میں ہے کہ حضرت یحییٰ کمل کی پوشاک پہنتے تھے اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں پر گزارہ کرتے تھے لیکن وقت کے حکمران کو انہوں نے اس کی ایک بیہودگی پر سخت سرزنش کی۔

اس لفظ سے اس گمان کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے کہ حضرت یحییٰؑ کوئی راہب تھے اور ان کی زندگی خلق سے الگ تھلگ تھی۔ وہ اپنی ذات کے معاملے میں بلاشبہ زاہد تھے لیکن ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ اس توبہ کی منادی کے لئے وقف تھا جس کے لئے وہ مامور ہوئے تھے اور اسی راہ میں انہوں نے اپنا سر کٹوا دیا۔

حصوراً کا مفہوم

تیسری یہ کہ وہ 'حصور' ہوں گے حصور، حصر سے فعول کے وزن پر ہے جس کے لغوی معنی ہوں گے اپنے آپ کو گھیرے رکھنے والا۔ یہیں سے اس کا استعمال اس شخص کے لئے ہوا جو لذات دنیا سے منقطع اور اپنے آپ کو کامل ضبط میں رکھنے والا ہو۔ یوں تو یہ ضبط نفس اس سرداری کی خصوصیات میں سے ہے جس کا ذکر اوپر ہوا اس لئے کہ جو اپنے آپ کو ضبط میں رکھ سکے گا وہی خلق کو بھی ضبط میں رکھنے والا بن سکے گا۔ لیکن حضرت یحییٰؑ و حضرت مسیحؑ دونوں نبیوں کی زندگیاں بالکل درویشانہ تھیں۔ انہوں نے زندگی کی ان لذتوں سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جو عام حالات میں کسی درجے میں بھی داخل دنیاداری نہیں قرار دی جا سکتیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے حالات خاص تھے۔ ان کے زمانے میں یہود پر دنیا کی محبت اتنی غالب آگئی تھی کہ ان کا رُخ موڑنے کے لئے ان کو زندگی کا ایک بالکل زاہدانہ و درویشانہ نمونہ رکھنا پڑا۔ یہ علاج بالضد کی ایک شکل ہے جو جسمانیات کی طرح روحانیات و اخلاقیات میں بھی خاص حالات میں اختیار کرنی پڑتی ہے۔ مقصود تو اس سے یہ ہوگا کہ یہ امت بالتدریج اس نقطۂ اعتدال کو اختیار کرنے کے قابل بنے جو بالآخر اللہ کے آخری دین میں ان کے سامنے آنے والا تھا لیکن نصاریٰ نے ان کے اس زہد کو رہبانیت کا رنگ دے دیا اور بعد کے زمانوں میں رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔

نبیاً من الصالحین کا مفہوم

چوتھی یہ کہ وہ نبی ہوں گے۔ نبی کا مفہوم واضح ہے۔ البتہ اس کے ساتھ 'مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ' کی جو وضاحت ہے اس سے مقصود ان کے زمرے کو بتانا ہے کہ وہ باہمہ صفات و کمالات تھے زمرہ صالحین ہی میں سے، یہ نہیں ہے کہ ان کو الوہیت کا کوئی مقام حاصل ہو گیا ہو۔ درآنحالیکہ کمالات و فضائل کے علاوہ حضرت عیسیٰؑ سے رشتہ داری کا تعلق بھی رکھتے ہیں اور ان کی ولادت بھی حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے بہت مشابہ ہے۔

بلکہ انجیلوں سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہی نے حضرت عیسیٰؑ کو بپتسمہ دیا اور حضرت عیسیٰؑ نے ان کی بابت فرمایا کہ "ماؤں نے جن کو جنا ان میں یوحنّا سے بڑا کوئی نہیں"۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ۝

سوال طلب تصدیق کے لئے

یہ سوال تعجب یا شک یا انکار کی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ یہ نہایت حسین و بلیغ انداز سے طلب تصدیق ہے۔ ان کے سامنے اس بشارت کے ظاہر ہونے میں جو رکاوٹیں تھیں وہ بیان کر کے حضرت زکریاؑ نے چاہا کہ یہ تصریح کرا لیں کہ ان رکاوٹوں کے باوجود یہ بشارت ظاہر ہونے کی شکل یہ ہوگی۔ كَذٰلِكَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ۔ یہ بات یوں ہی ہوگی۔ یعنی اللہ کا ارادہ یوں ہی ہے کہ یحییٰ کی ولادت بوڑھے باپ اور بانجھ ماں کے ہاں ہو۔ اصل چیز اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی ہے۔ اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اللہ چاہے تو پتھر کے اندر سے پانی کے چشمے جاری ہو سکتے ہیں اور صحرا کے سینے سے حباب اُٹھ سکتے ہیں۔ قرآن میں اسی قسم کا سوال و جواب حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت میں بھی منقول ہے۔ اس کی نوعیت بھی بعینہٖ یہی ہے۔

برطانیہ میں مسلمانوں کی حالت

(ایک مکتوب کی روشنی میں)

مخدومی و مکرمی ادام اللہ الطافکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

میرا تعلیمی کام اگرچہ مجھے خاصہ مصروف رکھتا ہے تاہم میں نے یہاں لوگوں میں گھومنے پھرنے کے کافی مواقع حاصل کئے ہیں۔ مختلف الخیال لوگوں سے تبادلہ خیال اور اپنے ذاتی مشاہدات واحساسات کی روشنی میں مَیں نے جو نتائج یہاں کے مسلمانوں کے بارے میں اخذ کئے ہیں، آج کی نشست میں ان کا مجمل تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

برطانیہ میں رہنے والے مسلمانوں کی صحیح تعداد تو میں اب تک معلوم نہیں کر سکا لیکن محتاط اندازوں کے مطابق تقریباً تین لاکھ مسلمان یہاں آباد ہیں۔ یوں تو ان میں ہر رنگ ونسل کے لوگ مل جائیں گے لیکن نسبتاً زیادہ تعداد عربوں، قبرصیوں اور پاکستانیوں کی ہے۔ ان میں بعض لوگ تو وہ ہیں جو آج سے بیس تیس سال قبل آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کے پیش نظر دولت کمانا ہے اور وہ برطانیہ کو اپنا مسکن بنانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ان کے علاوہ ایک تیسری قسم ان مسلمانوں کی ہے جو تعلیم کے حصول کے لئے یہاں آئے ہیں۔ ان میں بعض تو ہمہ وقتی طالب علم ہیں لیکن اکثر و بیشتر ملازمت کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ پڑھائی میں بھی مصروف ہیں۔ ان تینوں قسموں کے احوال وظروف ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں اس لئے ان سب کو یکساں سطح پر رکھنا ٹھیک نہ ہوگا۔

جہاں تک ان مسلمانوں کا تعلق ہے جو مدتہائے دراز سے یہاں آباد ہوگئے ہیں، اسلام ان کے ہاں ایک قصۂ پارینہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے ۔ یہاں کئی مرتبہ یہ اتفاق ہوتا ہے کہ آپ کسی اسٹور سے کوئی چیز خرید رہے ہیں، آپ کا خیال ہے کہ اسٹور میں کام کرنے والے انگریز ہیں مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ قبرص سے آئے ہوئے ہیں ۔ ان کے نام احمد، عثمان اور علی وغیرہ ہوں گے لیکن جمعہ، رمضان المبارک، عیدین یا کسی اسلامی شعار کا نام اُن کے سامنے لیجئے تو سوچ کر کہیں گے کہ ہاں ہمارے بزرگ اس طرح کی چیزوں میں دلچسپی رکھتے تھے، ہمیں تو ان کاموں کی فرصت ہی نہیں ہے۔

ان مسلمانوں میں خال خال ایسے افراد بھی مل جاتے ہیں جن کی تربیت کسی مذہبی ماحول میں ہوئی۔ ان کے دلوں میں اسلام کا تصور نسبتاً زیادہ راسخ تھا اس لئے وہ حالات کے ساتھ سو فیصد سازگاری پر آمادہ نہ ہو سکے ۔ ان میں نماز روزہ کا شعور باقی ہے۔ البتہ ان کو دوسری مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ اگر ان کی شادی کسی برطانوی عورت کے ساتھ ہوئی تھی تو وہ ان کی رفاقت پر آمادہ نہیں، وہ اپنی زندگی اپنے تصورات کے مطابق گزارنا چاہتی ہے ۔ بالفرض اگر بیوی بہت باشعور مل گئی تو اولاد کی فکر چین نہیں لینے دیتی۔ وہ ماحول کے رنگ میں پوری طرح رنگ جاتی ہے اور والدین کے لئے پریشانی کا باعث بنتی ہے ۔ اگر اولاد کو ماحول کے اثرات سے بچانے کے لئے والدین اپنے پچھلے ماحول میں بھیجتے ہیں تب بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ بچے ایک نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کسی کام کے نہیں رہتے۔

مسلمانوں کا دوسرا طبقہ جس کے پیشِ نظر دولت کمانا ہے ۔ تعداد کے لحاظ سے دوسرے دونوں طبقوں سے بہت زیادہ ممتاز ہے ۔ یہ لوگ برطانیہ میں کام کرنے کے ووچر لے کر آئے ہوئے ہیں اور فی الحقیقت یہاں کی ملوں اور فیکٹریوں کو رات دن چلتا رکھنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے کسی زمانے میں جس انگریز کی محنت کشی ضرب المثل تھی اب اس کی آرام کوشی اور سہل انگاری کے شکوے عموماً سننے میں آتے ہیں۔ اسی لئے رات کی شفٹیں، جفاکشی کے کام اور مشقت طلب ڈیوٹی اب اس کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ دوسرے ممالک سے آئے ہوئے

لوگوں کے سامنے چونکہ محنت و مزدوری کرنے ہی کا مقصد ہوتا ہے اس لئے وہ ان کاموں کو نسبتاً زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ کام کرنے میں ان کو معاوضہ بھی کچھ زیادہ مل جاتا ہے۔ ان مسلمانوں میں اگرچہ کافی لوگ متاہلانہ زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن غالب اکثریت کی یہ حالت نہیں۔

مسلمانوں کے اس طبقہ کی جو چیز میرے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ اعتراض ہے وہ ان کی دنیا طلبی اور مال و دولت کی محبت ہے۔ اس چیز نے ان کی نظروں سے اخلاقی، دینی اور ملّی تقاضے بالکل اوجھل کر رکھے ہیں۔ یہاں کی حکومت باہر کے مزدوروں پر پابندیاں عائد کرنے پر جو غور کر رہی ہے اس کے پیچھے بھی کسی حد تک ان لوگوں کی اپنی ہی غلطیاں کام کر رہی ہیں۔ ان کے ہاں بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی تو خیر بالکل ہی معمولی چیز ہے، سولہ گھنٹے کام کرنے والے افراد بھی ناپید نہیں۔ اس قدر مشقت کے بعد ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کوئی دینی فریضہ یا ملّی خدمت بھی انجام دیں گے، بالکل عبث ہے۔ اُن کی دنیا بس اپنی ذات ہی میں آباد ہوتی ہے۔ اس طرح کی شکایات یہاں عموماً سننے میں آتی ہیں کہ یہ لوگ ٹیکس کی کٹوتی بچانے کے لئے اپنے آپ کو شادی شدہ ظاہر کر دیتے ہیں درآنحالیکہ یہ مجرد ہوتے ہیں۔ حکومت نے بالغوں کے داخلہ پر جو پابندی لگا رکھی ہے یہ اس کو بھی عبث کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ اس طرح کی خبریں پڑھنے میں آتی ہیں کہ اپنے عزیز و اقارب کو کم عمر کا اور بیٹا ظاہر کر کے بعض لوگوں نے برطانیہ میں ان کو داخلہ دلوا دیا۔ رہائش کے طور طریقے بھی ان کے اچھے نہیں۔ وہ آبادیاں جہاں ان کے مکانات کافی ہوں یہاں کے لوگوں کی نظروں سے گر جاتی ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ لوگ صحت و صفائی کا زیادہ خیال نہیں رکھتے، اور ان کے مکانوں میں مکینوں کی تعداد اس تعداد سے عموماً زیادہ ہوتی ہے جو حکومت نے یہاں مقرر کر رکھی ہے۔

اس طرح کی خود غرضانہ ذہنیت کے ساتھ ان کاموں کو کوئی مناسبت نہیں جو بے لوثی اور قربانی چاہتے ہوں۔ اسی لئے برطانیہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہونے کے باوجود کوئی مضبوط دینی مرکز یا تنظیم نظر نہیں آتی۔ حالانکہ اگر شروع سے مسلمان مال و دولت جمع

کرنے کے ساتھ ساتھ اس سمت میں بھی کچھ قدم اٹھاتے تو اب تک معلوم نہیں کتنی منزلیں طے ہو چکی ہوتیں۔ حد یہ ہے کہ اس طبقہ کے ذہنی مفادات کی نگرانی کرنے والا کوئی ادارہ بھی یہاں موجود نہیں۔

اس طبقے میں زیادہ تعلیمیافتہ لوگ کم ہیں۔ اکثر و بیشتر بے پڑھے لکھے ہی ہیں۔ شاید اسی لئے ان میں سے وزن سے اجتناب کی کوشش نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں اکٹھے رہنے کا رجحان غالب ہے۔ ایک ہی مکان یا ایک محلے میں جب کئی لوگ ایک ہی ذوق کے آباد ہوں تو وہ کئی خرابیوں میں پڑنے سے بچ جاتے ہیں۔

جہاں تک طلبہ کے طبقے کا تعلق ہے، اس میں شائد افریقین اور عرب اکثریت میں ہیں لیکن پاکستانیوں کی بھی کمی نہیں۔ حکومت کی زرمبادلہ کے معاملہ میں کفایت کی پالیسی کے باعث پاکستانیوں کے پاس اللّے تللّوں کے لئے رقم بہت زیادہ نہیں ہوتی لیکن افریقی یا عرب نسبتاً زیادہ خوشحال ہوتے ہیں۔ نوعمری اور آزاد منشی کی وجہ سے یہ طبقہ ماحول کے اثرات کو جلد قبول کر لیتا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ایک پاکستانی ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی جو یہاں کسی ٹریننگ کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے رفقا کو بتانے لگے کہ شہر کی فلاں رقص گاہ میں اگر سبق لینے جاؤ تو وہاں کم فیس کے عوض میں اچھا رقص کرنا سیکھ جاؤ گے۔ اس کے بعد انہوں نے بڑے ناصحانہ انداز میں کہا کہ ہم لوگوں کو ملک سے باہر نکلنے کا موقع ہے تو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اگر ہم یہاں سے واپسی پر بھی اسی پرانے کھونٹے سے بندھے رہے تو یہاں آنے کا کیا فائدہ ہوا؟ یہاں سے کچھ عقل سیکھ کر ملک کو لوٹنا چاہیئے۔ ان ڈاکٹر صاحب کا نقطہ نظر ایک فرد کا نقطہ نظر نہیں بلکہ ایک خاصی بڑی تعداد کا نقطہ نظر ہے۔ یہ لوگ اپنے ممالک کی سماجی پابندیوں سے جب آزاد ہوتے ہیں تو اپنے سینوں کی تمام دبی آرزوؤں کو پورا کرنے کا تہیہ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ جب میں کراچی سے لندن آ رہا تھا تو ہوائی جہاز میں میرے برابر بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے جو قانون کی تعلیم کے لئے یہاں آ رہے تھے، پہلے ہی مرحلے پر خالص انگریزی کھانے پر ہاتھ صاف کئے۔ ان کو شائد ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ یہ کھانا مذہبی نقطہ نظر سے حلال ہے یا حرام، یہی

صورتِ حال یہاں دیکھنے میں آئی جو طلبہ اپنے آپ کو اخلاقی زوال کے گرداب سے بچائے رکھتے ہیں، ان میں بھی دینی واجبات کے معاملہ میں سرد مہری تو پیدا ہو ہی جاتی ہے حتیٰ کہ بعض طلبہ، جو دینی تحریکوں سے بھی اپنے آپ کو وابستہ کئے ہوتے ہیں، انگریزی طریقہ کے گوشت کو کھانے میں قباحت نہیں سمجھتے اور اگر ان کو سمجھانے کی کوشش کی جائے تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہاں رہتے ہوئے تو اضطرار کی حالت درپیش ہے، اپنے ملک کو جاتے ہوتے اس سے توبہ کر لیں گے۔

برطانیہ میں مسلمانوں کی معتدبہ تعداد کے ہوتے ہوتے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ ان میں جمعیت مفقود ہے اور کوئی ادارہ ان کی رہنمائی کے لئے کام نہیں کر رہا ہے۔ اصولاً لندن کے اسلامک کلچرل سنٹر کو ان ہی فرائض سے عہدہ برآ ہونا چاہیئے۔ یہ مرکز فی الحقیقت برطانیہ میں اسلام کی تبلیغ کے لئے قائم ہوا تھا، بعد میں تمام اسلامی ملکوں کے سفیروں پر مشتمل اس کی کمیٹی بنائی گئی۔ اب تک تمام حکومتیں اس کو گرانٹ دیتی ہیں۔ متحدہ عرب جمہوریہ کے ایک صاحب اس کے ڈائرکٹر ہیں۔ اس اہتمام اور وسائل کی ارزانی کے باوجود اس ادارے کی مصروفیتوں کا طول وعرض جمعہ، عیدین کی نمازوں کے انتظام اور شادی کے خواہشمند جوڑوں کا نکاح پڑھانے تک محدود ہے۔ ہماری حکومتیں جس طرح دین کے معاملہ میں سرد مہر واقع ہوتی ہیں، کچھ وہی کیفیت اس مرکز کی بھی ہے۔

چھوٹی چھوٹی انجمنوں اور مسلم ایسوسی ایشنوں کی یہاں کمی نہیں۔ شاید ہر شہر میں ایک سے زیادہ ایسی انجمنیں مل جائیں گی۔ ان میں زیادہ تر انجمنیں علاقائی بنیادوں پر قائم ہیں مثلاً پاکستانی، ملائی، کشمیری، آزاد کشمیری، عرب وغیرہ۔ گویا ان کے ذریعے ہم پیالہ وہم نوالہ لوگوں کو آپس میں مل بیٹھنے کا موقع مل جاتا ہے یا کبھی کبھار کوئی کلچرل پروگرام منعقد کر لیتے ہیں۔ ان کے برعکس گزشتہ تین چار سال سے لوگوں کا رجحان کچھ اسلامی انجمن سازی کی طرف بھی ہے اس کا مظاہرہ یوکے اسلامک مشن اور بعض مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشنوں کے قیام کی شکل میں ہوا ہے۔

یوکے اسلامک مشن کا قیام پاکستانیوں کی کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔ اس کے

مقاصد اور طریق کار کسی قدر اسلامی جمعیت طلبہ سے ملتے جلتے ہیں۔ اس کے قیام پر اگرچہ دو اڑھائی سال گزر چکے ہیں تاہم اس کا کام پاکستانیوں ہی تک محدود ہے۔ ان سے باہر ابھی تک اس کا حلقہ اثر پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ میرے نزدیک اس کی ایک وجہ تو کارکنوں کی اپنی مجبوری ہے کہ انہیں اپنے ہم وطنوں میں کام کرنے میں زیادہ آسانی معلوم ہوتی ہے دوسرے اس کا مخصوص جماعتی مزاج بھی اس کے پھیلنے میں مانع ہے۔

مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشنیں تقریباً یہاں کی تمام یونیورسٹیوں میں اور بڑے کالجوں میں قائم ہیں۔ ان میں مختلف ممالک کے مسلمان طلبہ شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسوسی ایشنوں کے قیام کا سہرہ عرب طلبہ کے سر ہے۔ ان کے پیش نظر اسلامک اسٹڈی سرکل قائم کرنا اور اسلامی مسائل پر تقاریر کا انتظام کرنا ہے۔ گزشتہ دو سال سے ان ایسوسی ایشن میں باہم رابطہ پیدا کرنے کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔ جن کے نتیجہ میں فیڈریشن آف مسلم سٹوڈنٹس سوسائٹیز وجود میں آئی ہے۔ سولہ ایسوسی ایشنیں اس فیڈریشن کی ممبر ہیں۔ یہ لوگ وقتاً فوقتاً اکٹھے ہونے کے لئے کیمپ بھی لگاتے ہیں جن میں اسلامی موضوعات پر تقاریر کا اہتمام ہوتا ہے۔ فیڈریشن کے بین الاقوامی مزاج کا یہ فائدہ بہت اہم ہے کہ اس سے مختلف ممالک کے مسلمان طلبہ میں مفاہمت پیدا ہوتی ہے۔

تبلیغی جماعت دوسرے ممالک کی طرح یہاں بھی سرگرم ہے۔ مختلف شہروں میں اس کی ہفت روزہ مجالس منعقد ہوتی ہیں، جن میں تبلیغ کا پروگرام بنتا ہے اور جماعتیں تبلیغ کے لئے روانہ ہو جاتی ہیں۔

ان دینی جماعتوں کے قیام کا ایک اثر یہ مترتب ہوا ہے کہ اب لوگوں میں مساجد قائم کرنے کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ جہاں جہاں مسلمان کچھ تعداد میں رہ رہے ہیں ان کو یہ احساس ہو رہا ہے کہ نماز کا انتظام ہونا چاہیئے۔ متعدد مقامات پر یہ انتظام ہو چکا ہے اور کچھ دوسری جگہ پر چندہ جمع کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ عیدین کی نمازوں کی ادائیگی میں اب زیادہ سرگرمی دیکھنے میں آتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ مساجد کے قیام کے نتیجہ میں دینی فضا پیدا کرنے میں زیادہ مدد ملے گی۔

یہاں کے حالات میرے نزدیک اس بات کے متقاضی ہیں کہ مختلف دینی تنظیموں کے درمیان اعتماد، تعاون اور مفاہمت پیدا ہو تاکہ ان کی سرگرمیاں ایک ہی نقطہ پر مرتکز ہوں۔ اس کے علاوہ طریقِ کار کے لحاظ سے اسلامی ہوسٹلوں کے قیام کو اپنایا جائے۔ یہاں کا تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ متعدد ساتھیوں کے یکجا رہنے سے بہت سی خرابیاں ان پر اثر نہیں کرتیں۔ زیادہ لوگ اس وقت خراب ہوتے ہیں جب ان کو اپنے مزاج کی سوسائٹی نہیں ملتی۔ اسلامی ہوسٹلوں کے قیام کے نتیجہ میں یہ سوسائٹی مہیا کی جاسکتی ہے۔ یہاں ہر بڑے شہر میں سینکڑوں مکان مسلمانوں نے خرید لئے ہیں۔ اگر وہ ذرا سی پابندی کرایہ داروں کے انتخاب میں گوارا کر لیں تو یہ کام کچھ ایسا مشکل نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ یہاں پر انگریزی میں اسلام پر بالکل بنیادی لٹریچر مہیا کرنے کی کوشش ہونی چاہیئے۔ ہمارے موجودہ لٹریچر میں ایسی کتابیں بالکل نایاب ہیں جو ایک بے علم مسلمان یا ایک نومسلم انگریز کو دین کی ابتدائی معلومات دے سکیں۔ مزید برآں یہاں اسلامک کلچرل سنٹر کی طرز کے ایک ادارے کے قیام کی بھی ضرورت ہے جو اسلامی حکومتوں کے اہتمام میں نہیں بلکہ دینی تنظیموں کے اہتمام میں چلایا جائے تاکہ اس پر لوگوں کا اعتماد ہو اور وہ مختلف مسائل میں اس کی طرف رجوع کر سکیں اور اس سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔ یہی ادارہ مسلمانوں کے ملی مسائل سے بھی عہدہ برآ ہو اور ان کی آواز کو حکومت کے کانوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ ایسے ادارہ کے قیام میں برطانیہ سے باہر کے لوگوں کے تعاون کی بھی ضرورت ہے۔

اعتذار :- 'میثاق' کے جون کے شمارہ کے بارے میں قوی امید تھی کہ صحیح وقت پر شائع ہوجائے گا لیکن یک بیک ایسے حالات رونما ہوئے جن کی وجہ سے یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ اب جون کے پرچے ساتھ جولائی کا شمارہ بھی تقریباً مکمل ہوگیا ہے جو انشاءاللہ مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں قارئینِ کرام کو وصول ہوجائے گا۔

ناظم ماہنامہ "میثاق" لاہور

تقریظ و تنقید

کامل اکمل حقانی

(جلد اوّل)

تالیف :- پیر میر عزیز اللہ حقانی
ناشر :- علی بک ڈپو اردو بازار کراچی
صفحات :- ۷۴۴
قیمت :- دس روپے

'کامل اکمل حقانی' ان مسائل و ہدایات کا ایک جامع مجموعہ ہے جن سے آشنا ہونا ہر مسلمان کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا مفصّل بیان ہے۔ مؤلف نے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے فضائل و آداب اور والدین، اقربا اہل و عیال اور یتامیٰ و مساکین کے حقوق قرآن و سنت سے واضح کئے ہیں نیز اکابر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب اور اوامر و نواہی پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کی ترتیب میں اچھوتا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ کتاب کے موضوعات کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے سب سے پہلے ہر موضوع کی مناسبت سے قرآنی آیات مع اردو ترجمہ درج کی گئی ہیں اور اس کے بعد اس موضوع سے متعلق احادیث نبوی نقل کی ہیں۔

علم دین سے بڑھتی ہوئی بے رغبتی اور تلاشِ معاش کی مصروفیت کے اس دور میں عامۃ الناس کو دین حق کے مبادی سے روشناس کرانے کے لئے مسائل کا یہ مرقع بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

ڈار

محی الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمان پورہ۔ اچھرہ لاہور ۱۸ سے شائع کیا۔

جولائی 1965ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے
سالانہ چھ روپے (بیرون دس شلنگ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

فون نمبر ۶۹۱۰۱

جلد ۱۱ | ربیع اول سنہ ۱۳۸۵ھ | شمارہ ۷

فہرست مضامین

ترسیل زر و خط کتابت کا پتہ:-

ناظم ماہنامہ میثاق، رحمان پورہ۔ اچھرہ۔ لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کے لئے ترسیل زر کا پتہ:-

منیجر دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح

سرائے میر۔ اعظم گڑھ (یو۔ پی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

میثاق کا یہ شمارہ نہایت پریشانی کے حالات میں مرتب ہوا ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا لکھا گیا ہے اور کیا چھپا ہے۔ تاخیر تو عام حالات میں بھی اس رسالہ کا معمول بن چکی تھی۔ لیکن اب تو جن حالات و مسائل میں، میں گھر گیا ہوں نہیں کہہ سکتا کہ بے نظمی و بے قاعدگی کے ساتھ بھی پرچہ جاری رہ سکے گا یا نہیں۔ اس دوران میں مجھے نقل مکان کی اُلجھنوں سے بھی دوچار ہونا پڑا، اس لئے کہ ابو صالح مرحوم کے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے مجھے رحمان پورہ سے منتقل ہو کر فیروز پور روڈ پہ آنا پڑا اور اب تک کوئی ایسا مکان حاصل نہیں ہو سکا ہے جس میں ان بچوں کے ساتھ یکجا قیام کی صورت پیدا ہو سکے۔ میثاق کا دفتر بھی ابھی ایک عارضی جگہ پہ ڈال دیا گیا ہے۔ ہر چیز اُلجھی ہوئی ہے اور صرف اللہ ہی کو علم ہے کہ اس الجھاؤ کے سلجھنے کی کوئی شکل نکلے گی یا نہیں۔

میں اب ایک عرصے سے تفسیر تدبر قرآن اور حلقہ تدبر قرآن کے سوا دوسرے تمام کاموں سے تقریباً الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ ذمہ داریاں خواہ گھر کی ہوں یا باہر کی ان سے جی گھبراتا تھا۔ معاش کی مجبوریوں کے سبب سے زمینداری کی تھوڑی سی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی لیکن یہ کام بھی بارے باندھے ہی کرتا تھا۔ لڑکوں نے اپنی ذمہ داریاں خود نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سنبھال لی تھیں اور اب وہ اس قابل تھے کہ مجھے اُمید تھی کہ مجھ سے متعلق جو بعض ذمہ داریاں باقی رہ گئی ہیں ان سے وہ مجھ سے زیادہ خوبی کے ساتھ عہدہ برا ہو سکیں گے لیکن ابو صالح مرحوم کی ناگہانی موت نے حالات کا سارا نقشہ ہی بدل دیا۔ اب نہ صرف میرا

ذمہ داریاں مجھ سے از سرِ نو توجہ کا مطالبہ کر رہی ہیں بلکہ مرحوم ابوصالح نے اپنی ذمہ داریاں بھی میرے ناتواں کندھوں پر ڈال دی ہیں۔ اس نے چھوٹے چھوٹے چھ بچے چھوڑے ہیں جن میں سب سے بڑی بچی کی عمر کل آٹھ سال ہے۔ ان بچوں کی اٹھان ایک خاص نہج پر ہوئی ہے مجھ سے دُور رہنے کے سبب سے یہ مجھ سے اچھی طرح مانوس بھی نہیں ہیں۔ ان کے بھولے پن کا یہ عالم ہے کہ میری ایک پوتی جو شکل و شباہت اور مزاج و عادات میں اپنے مرحوم باپ کا کامل نمونہ ہے، ایک شب میں سوتے وقت اپنی نانی اماں سے پوچھ بیٹھی کہ "اماں! اللہ میاں کس چیز کی فراک پہنتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا کہ "نُور کی"۔ یہ جواب اس کے حافظے میں محفوظ رہ گیا۔ صبح کو جب وہ اٹھی اور اس کی نانی اس کو نہلا کر اس کی فراک بدلنے لگیں تو وہ مچل گئی کہ میں تو نور کی فراک پہنوں گی"۔ اور نور کی فراک کے لئے ایسی بضد ہوئی کہ سارے گھر کے لئے ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے جدید کلامی دلائل کے ساتھ مداخلت کرنی پڑی تب کہیں جا کر یہ نزاع ختم ہوئی۔

مولیناشبلی نعمانی رحؒ نے اپنے بھائی مولوی اسحاق مرحوم کا جو دردانگیز مرثیہ لکھا ہے وہ بچپن میں مجھے پورا زبانی یاد تھا اور اس کے جو شعر مجھے خاص طور پر پسند تھے ان میں وہ شعر بھی تھا جس میں مولانا نے مولوی اسحاق مرحوم کے بچوں کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

یہ شعر میں اکثر نہایت رقت انگیز انداز میں پڑھا کرتا تھا۔ اب یہ راز کھلا کہ یہ شعر مجھے اس درجہ کیوں پسند تھا۔ معلوم ہوا کہ مولینا نے اس شعر میں اپنے ہی درد دل کی کہانی نہیں سنائی تھی بلکہ اس میں میرا درد دل بھی شامل کر دیا تھا۔ میرا یہ ایک مستقل نظریہ ہے کہ آدمی کو شعر وہی پسند ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے دل کی صدائیں سُنتا ہے۔

مجھے اچھی طرح علم ہے کہ آدمی پر ذمہ داریاں خُدا ڈالتا ہے اور وہی اُن کے اٹھانے

کی توفیق و ہمت بھی عطا فرماتا ہے۔ میں جو خوف و ہراس محسوس کر رہا ہوں یہ محض علم کی کمی اور طبیعت کی سہل پسندی کا نتیجہ ہے۔ جو امتحان باقی ہیں وہ ہو کے رہیں گے۔ وہ اس وجہ سے نہیں ملتوی ہو جائیں گے کہ میں امتحان سے گھبراتا ہوں اور کمر کھول کے اب سستانے اور آرام کرنے کا خواہشمند ہو گیا ہوں۔ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جس سے کسی حال میں مفر نہیں ہے۔ اسی سے بندے کی صلاحیتیں اجاگر ہوتی اور اس کی کمزوریاں دُور ہوتی ہیں۔ آدمی کا بڑھاپا بھی اس کے لئے کوئی عذر نہیں ہے۔ بڑھاپے میں جس طرح جسمانی بیماریاں اور کمزوریاں لاحق ہوتی ہیں اسی طرح عقلی و ایمانی بیماریاں بھی لاحق ہوتی ہیں۔ آدمی جب عصائے پیری کا محتاج ہوتا ہے تو بہت سی غلط چیزوں پر تکیہ کرنے لگتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی توحید کے معاملے میں بڑا غیور ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کا بندہ کسی اور پر اعتماد کرے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس عمر میں آ کر میرے اندر بھی ایک غلط قسم کا اعتماد پیدا ہو چلا تھا۔ اگرچہ میری کوئی ضرورت ابو صالح سے وابستہ نہیں تھی مگر ایک باپ کو اپنے بیٹے پر جو فخر و ناز ہوتا ہے غیر محسوس طور پر وہ میرے اندر بھی تھا، اس کی شہرت و ناموری سے میرے دل کو خوشی ہوتی تھی، لوگ اس کی تعریفیں کرتے تھے تو میرے خون میں اضافہ ہوتا تھا، اس کے بھرے گھر کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوتا تھا۔ میں جب پیار سے یا غصہ سے اس کو بیوقوف کہتا تھا اور وہ مسکرا کر نگاہیں نیچی کر لیتا تھا تو مجھے فخر ہوتا تھا کہ میں ملک کے ایک نامور صاحبِ قلم اور چوٹی کے صحافی کو بیوقوف کہہ دیتا ہوں اور وہ میرے اس خطاب پر خوش ہوتا ہے ——— اس طرح غیر محسوس طور پر میں نے ابو صالح کے اعتماد پر اپنے دل کے اندر پندار کا ایک صنم خانہ تعمیر کر لیا تھا۔ قدرت نے ۲۰ مئی کی صبح کو اس صنم خانے کو ڈھا دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے اس حادثے سے بڑا غم ہوا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس حادثے کے بعد سے میرے اور میرے پروردگار کے درمیان کوئی حجاب حائل نہیں رہا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا خاتمہ اس حال میں کرے کہ میرا دل اعتمادِ غیر کے ہر شائبہ سے پاک ہو۔

مرحوم کے بعض دوستوں کی باصرار یہ خواہش ہے کہ میں اس کے ابتدائی حالات اور

اس کے مزاج کی خصوصیات پر ایک مضمون لکھ دوں ۔ یہ مضمون میں ان شاء اللہ لکھ دوں گا
لیکن ابھی نہیں ۔ ابھی تو میری کوشش یہ ہے کہ دل پر اس کے تصور کا جو غلبہ ہے وہ کچھ کم ہو
تاکہ میں کچھ پڑھنے لکھنے اور سوچنے سمجھنے کے قابل ہو سکوں ۔ میرا یہ گمان نہیں ہے کہ اس میں
یں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں ۔ نہیں ، اس میں نقائص بھی تھے لیکن میں اس کے نقائص میں
اپنے نقائص کا عکس دیکھتا تھا ۔ اس کی امی جب اس طرح کی کسی چیز کی شکایت کرتیں
تو میں اُن کو جواب دیتا کہ اس چیز کی فکر نہ کرو ، یہ چیز اس نے باپ سے وراثت میں پائی ہے ،
جس طرح باپ کے دماغ کو عمر اور تجربے نے درست کر دیا ہے اسی طرح عمر اور تجربہ سے
اس کا دماغ بھی درست ہو جائے گا ۔ مجھ سے ، میرے خاندان کی روایات کے زیرِ اثر ، اس
لو ایک حجاب سا رہا لیکن یہ حجاب محض ظاہر کا پردہ تھا ، اس پردے کے پیچھے جس طرح
ہ میرے دل میں بسا ہوا تھا اسی طرح میں بھی اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا ۔ بھائیوں ،
بہنوں ، عزیزوں سے اسے نہایت گہری محبت تھی ۔ اپنی چھوٹی بہن ۔ مریم صدیقہ ۔ کو پیار
سے ہمیشہ "منی" کہتا تھا اور اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش بلا تاخیر پوری کرتا تھا ۔ پچھلے دنوں وہ بیمار ہو
ئی تو اس کی تیمارداری اور دیکھ بھال میں اس نے رات دن ایک کر دیئے ۔ اس کے اپریشن
ل نوبت آئی تو لاہور میں جو بہتر سے بہتر انتظام ممکن تھا اس نے وہ کیا ۔ اس کا ایک چھوٹا
بھائی بھارت میں ہے اس کے لئے وہ مجھ سے زیادہ فکر مند رہتا تھا ۔ اپنے دوسرے چھوٹے
بھائی ابوسعید سلمہٗ کو اس نے تعلیم دلائی اور اب اگست میں اس کے امریکہ جانے کا پروگرام
تھا طبیعت نہایت خوددار ، فیاض اور غمگسار پائی تھی ۔ اس کے اخلاق سے متعلق نہ صرف یہ کہ
کبھی کوئی شکایت سُننے میں نہیں آئی بلکہ اس کے خاص دوستوں نے بقید قسم یہ شہادت
دی کہ اس سے زیادہ پاکیزہ نگاہ نوجوان انہوں نے نہیں دیکھا ۔ میں جانتا ہوں کہ یہ چیز اس
میں بربنائے تقویٰ نہیں تھی بلکہ محض طبیعت کے ترفع کا نتیجہ تھی لیکن میں مطمئن تھا کہ اس ترفع
نے اسے بہت سے فتنوں سے محفوظ رکھا ۔ اس ترفع ہی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ معیارِ
زندگی اونچا رکھنے کے باوجود مکان پر نام کی تختی نہیں لگواتے تھے ، گھر پر فون نہیں رکھتے
تھے ، اخبار میں اپنی تصویر نہیں چھپواتے تھے بلکہ تاکید تھی کہ اگر کسی گروپ کے ساتھ ان کی

تصویر بھی ہو تو ان کی تصویر کاٹ کر گروپ کی تصویر اخبار میں دی جائے۔ اسی طرح اپنے مخصوص کالم پر، جس کی اخباری دنیا میں بڑی دھوم تھی، کبھی اپنا نام نہیں دیا۔

صحت بہت اچھی تھی۔ آنکھیں ہمیشہ ہنستی ہوئی رہتی تھیں۔ مطالعہ بہت کرتے تھے اور معلومات بہت وسیع تھیں لیکن مطالعہ اور معلومات کا بوجھ چہرے بشرے سے نمایاں نہیں ہوتا تھا۔ چہرہ ہمیشہ تازہ گلاب کی طرح شگفتہ رہتا۔ تفریحات میں سے صرف احباب کے ساتھ مجلس آرائی سے دلچسپی تھی۔ ان کے اکثر احباب عمر میں ان سے بڑے تھے لیکن مشہور روایت یہی ہے کہ جس مجلس میں ہوتے اپنے حسن بیان، اصابت رائے اور وسعتِ معلومات کی وجہ سے نمایاں رہتے۔ دل میں دُنیا حاصل کرنے کی خواہش تھی لیکن بڑی خودداری اور اصُول کے ساتھ۔ پچھلے دنوں انہیں ایک خاص حلقے کی طرف سے بڑی اہم پیشکش ہوئی لیکن انہوں نے نہایت بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دی۔ حلقہ ملاقات و تعلقات ہر طبقے میں بہت وسیع تھا لیکن اس سے ذاتی فوائد حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ البتہ اس سے دوسرے ضرورت مندوں کو فائدے پہنچائے۔ دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی کمزوریوں سے درگزر فرمائے اور اس کی نیکیوں کو قبول فرمائے۔

تدبر قرآن

۵

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورہ آلِ عمران

قَالَ رَبِّ اجْعَل لِّي آيَةً ۖ قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا ۗ وَاذْكُر رَّبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴿٤١﴾

حضرت زکریا نے یہ باتیں ایک ہاتفِ غیبی سے سُنی تھیں اور اچھی ساعت اور اچھے حالات میں سُنی تھیں اس وجہ سے ان کو گمان تو یہی تھا کہ یہ بشارت من جانب اللہ ہی ہے لیکن وہ نہایت متواضع متقی اور محتاط بندے تھے اس وجہ سے دل کے ایک گوشے میں کھٹک یہ بھی تھی کہ ممکن ہے یہ اپنے ہی گنبدِ دل کی صدائے بازگشت سنائی دی ہو، ممکن ہے اس کے اندر نفس کی مخفی آرزوں کو کوئی دخل ہو جن سے شیطان نے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو، اس وجہ سے انہوں نے اپنے رب سے درخواست کی کہ اے رب میرے لئے کوئی ایسی نشانی ٹھہرا دے جس سے مجھے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ بشارت تیری ہی طرف سے ہے، اس میں نفس یا شیطان کا کوئی دھوکا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمائی اور فرمایا کہ تمہارے لئے نشانی یہ ہے کہ تم تین شبانہ روز کسی سے کوئی بات زبان سے نہ کر سکو گے، صرف اشارے سے کر سکو گے، البتہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی تسبیح کر سکو گے سو اس دوران میں زیادہ سے اللہ کا ذکر کرنا اور شام و صبح اپنے پروردگار کی تسبیح میں مشغول رہنا۔

ظاہر ہے کہ ایک خاص مدت کے لئے آدمی پر ایک ایسی حالت کا طاری ہو جانا کہ وہ زبان سے کوئی دنیوی قسم کی بات تو نہ کر سکے لیکن تسبیح و تہلیل کر سکے کسی شیطانی تصرف کا نتیجہ

نہیں ہو سکتی، یہ ہو سکتی ہے تو رحمانی تصرف ہی کا کرشمہ ہو سکتی ہے۔ کسی شیطانی اثر سے یہ بات پیدا ہوتی تو اس کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ظاہر ہوتا تھا۔ یعنی آدمی اپنی دنیاداری کی باتیں تو کر سکتا لیکن اللہ اللہ کرنا اس پر شاق گزرتا۔ اگر حضرت زکریا پر یہ حالت غیر اختیاری طور پر طاری کر دی گئی تو یقیناً یہ اس بات کی ایک قطعی نشانی تھی کہ ان کو بیٹے کی جو بشارت ملی ہے من جانب اللہ ہے، اس میں شیطانی دھوکے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں ضمناً اس بات کی تردید بھی کر دی جو انجیل لوقا میں بیان ہوئی ہے کہ حضرت زکریا کو یہ حالت جو پیش آئی وہ ان کے اس جرم کے سزا کے طور پر تھی کہ انہوں نے فرشتے کی بات کا اعتبار نہ کیا اور سوال کر بیٹھے کہ مجھے اس کی کوئی نشانی دی جائے۔

جو لوگ قرآن کے اسلوب بیان سے اچھی طرح آشنا نہیں ہیں ان کو ممکن ہے یہ شبہ پیش آئے کہ آیت میں یہ تو مذکور ہے کہ تم تین دن کسی سے بجز اشارہ کے بات نہ کر سکو گے لیکن اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ ذکر و تسبیح کر سکو گے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ آیت میں اس تصریح کی جگہ تسبیح و تہلیل کی ہدایت رکھ دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہدایت اسی لئے کی گئی ہے کہ وہ یہ کام کر سکتے تھے۔ اگر اس ہدایت کے ساتھ وہ تصریح بھی ہوتی تو یہ ایک بے فائدہ طوالت ہوتی جو قرآن کی بلاغت کے شایانِ شان نہیں ہے۔

"بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ" اور اس قسم کے دوسرے اسالیب، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ احاطہ کے مفہوم پر دلیل ہوتے ہیں جس طرح ہم بولتے ہیں صبح شام، رات دن اللہ کو یاد رکھو۔

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٢﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾

حضرت مریمؑ کا اصطفاء کس غرض کیلئے

"اصطفاء" کے معنی چھانٹنے اور انتخاب کرنے کے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کا مفہوم اللہ تعالیٰ کا اپنے کسی بندے کو کسی کارِ خاص کے لئے منتخب کر لینا ہے۔ حضرت مریمؑ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ یہ نشانی ایک بہت بڑی خدائی امانت بھی تھی جو ان کے سپرد ہونے والی تھی اور ساتھ ہی ایک عظیم ابتلا بھی۔ یہ چیز ان

بات کی مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اس بارِ امانت کے اٹھانے کے لئے ان کی خاص تربیت فرمائے تاکہ وہ آنے والے مراحل میں حالات کا مقابلہ کرنے کی اہل بن سکیں۔ اسی تربیت کو یہاں 'تطہیر' سے تعبیر فرمایا ہے۔ پھر اس اصطفاء کے متعلق تصریح فرمائی کہ یہ اصطفاء کوئی معمولی اصطفاء نہیں تھا بلکہ یہ تمام عالم کی عورتوں پر تھا۔ اصطفاء کے بعد 'علیٰ' کا صلہ جب آتا ہے تو اس کے اندر ترجیح اور فضیلت کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم امانت سپرد کرنے کے لئے تمام دنیا کی عورتوں میں سے انہیں کا انتخاب فرمایا۔ یہ ایک ایسا شرف ہے جس میں حضرت مریم کا کوئی شریک وسہیم نہیں۔

اس بارِ امانت کی تیاریوں کے لئے ہاتفِ غیب نے ان کو ہدایت کی کہ 'اُقْنُتِي لِرَبِّكِ الآیہ' قنوت کے معنی دوسرے مقام پر ہم واضح کر چکے ہیں کہ پوری نیازمندی اور پورے تذلل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف جھک جانے کے ہیں۔ اس نیازمندی اور تذلل کا بہترین اظہار نماز میں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے بعد 'وَاسْجُدِي وَارْكَعِي' گویا 'وَاقْنُتِي' کے اجمال کی تفصیل ہوئی۔ بلاغت کا یہ نقطہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ نماز کا ذکر یہاں اس کے اہم اجزا سے ہوا ہے۔ یہ اسلوب قرآن نے جہاں اختیار کیا ہے اس سے نماز کے استغراق و انہماک، اس کی مداومت اور اس کے لئے اضطراب و بیقراری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نکتے کی خدا نے چاہا تو ہم آیت 'تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا' کی تفسیر کرتے ہوئے وضاحت کریں گے۔
اس کے ساتھ 'مع الراکعین' کی قید نماز باجماعت کی اہمیت کو بھی واضح کرتی ہے اور یہ اس نماز کی تصویر بھی ہے جس کی سعادت حضرت مریمؑ کو حاصل تھی۔ وہ چونکہ ہیکل ہی میں معتکف تھیں، اس وجہ سے انہیں خلوت کی نمازوں کے ساتھ ساتھ جماعت کی نمازوں کی برکات بھی حاصل تھیں۔

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ۝ ۴۴

یہ ایک آیت اثنائے کلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت رکھتی ہے۔ آپ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ غیب کی باتیں ہیں یعنی تمہارے علم و اطلاع سے باہر کی ہیں اس

لئے کہ نہ تو یہ ساری باتیں تورات و انجیل ہی میں موجود ہیں اور نہ تم شخصاً ہی ان واقعات کے پیش آنے کے وقت موجود تھے، پھر اس صحت و صداقت کے ساتھ تمہارا ان واقعات کا پیش کرنا کہ اہلِ کتاب کی بھی آنکھیں کھل جائیں بغیر اس کے کس طرح ممکن ہوا کہ اللہ نے تم کو منصبِ رسالت سے نوازا اور شرف وحی سے ممتاز کیا۔ یہ اہلِ کتاب پر تمہاری نبوت و رسالت کی ایک بہت بڑی حجت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انجیلوں میں اہلِ کتاب کی تاریخ کا یہ حصہ تقریباً غائب ہے، بس کچھ غیر مربوط باتیں لوقا میں حضرت یحییٰ کے متعلق ملتی ہیں اور بعض اشارات حضرت مریم کے متعلق، اور سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ حضرت مریم کا ذکر جو ہے بھی وہ ایک عام عورت کا ذکر معلوم ہوتا ہے، حد یہ ہے کہ انجیل کے بعض مقامات سے تو یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت مسیح بھی ان کا اس طرح احترام نہیں کرتے تھے جس طرح ماں کا احترام کرنا چاہیئے۔ عیسائیوں نے عقیدے کے طور پر چاہے حضرت مریمؑ کو جو درجہ بھی دیا ہو لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کا اصلی اور حقیقی شرف قرآن ہی نے نمایاں کیا ہے۔ آگے مناسب مقامات پر ہم اس مسئلے پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

(حاشیہ: حضرت مریم کے معاملہ میں قرعہ اندازی کی نوعیت)

اقلام سے مراد قرعے کے تیر ہیں۔ جوئے کے تیروں کا استعمال تو شریعت میں حرام ہے لیکن قرعے کے لئے تیروں کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں ہے حقوق مساوی ہونے کی صورت میں تصفیہ نزاع کے لئے قرعے کا طریقہ بالکل جائز ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ قرعہ اندازی کا یہ طریقہ صرف حضرت مریم کی کفالت ہی کے باب میں اختیار کیا گیا یا دوسرے زیر تربیت خدام ہیکل کے لئے بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ ہمارے نزدیک دونوں ہی باتوں کا امکان ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ تمام نو وارد خدام کی کفالت کا فیصلہ اسی طریقہ سے ہوتا رہا ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ حضرت مریم کا معاملہ لڑکی ہونے کی وجہ سے خاص نزاکت کا حامل تھا اسی وجہ سے قرعہ سے اس کا فیصلہ کیا گیا ہو۔ قرعہ ایک اشارۂ غیبی پر بھی محمول کیا جاتا ہے۔ ہیکل میں اس کے خدام کے فرائض کی تقسیم کے لئے قرعہ کا طریقہ رائج تھا۔ لوقا میں ذکر ہے کہ جس روز حضرت زکریا کو بیٹے کی بشارت ملی ہے اس روز جس خدمت پر وہ مامور تھے اس کا فیصلہ قرعہ ہی کے ذریعہ سے ہوا تھا۔

'وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ' میں جس جھگڑے کا ذکر ہے اس کا تعلق صرف حضرت مریمؑ کی سرپرستی سے نہیں معلوم ہوتا، ایسا ہوتا تو اس کا ذکر الگ کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کو بھی پہلے ٹکڑے ہی کے تحت آنا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ جھگڑا خدام ہیکل میں اس سوال پر ہوا ہوگا کہ ایک لڑکی ہیکل کے زمرۂ خدام میں شامل ہو سکتی ہے یا نہیں؟ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ اس کی روایت ہیکل کی تاریخ میں کم از کم معروف نہیں تھی۔ اس وجہ سے یہ سوال موجب نزاع ہو سکتا تھا۔ ویسے یہ بات بھی بعید نہیں ہے کہ محض تنافس فی الخیر اس جھگڑے کا باعث ہوا ہو اس لئے کہ ایک ایسی لڑکی کی کفالت، جو معبد کی خدمت کے لئے وقف کی جا رہی ہو اور جس کی قبولیت روزِ اول سے نمایاں ہو، ایک بہت بڑی سعادت تھی جس سے محروم ہونا ہیکل کے خدام میں سے کوئی بھی پسند نہ کر سکتا تھا۔

۱۳۔ آگے کا مضمون ۴۵ - ۶۳

اب یہ وہ اصل بات آ رہی ہے جو درحقیقت سورہ کا عمود ہے۔ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں خطاب نصاریٰ سے ہے اور مقصود ان پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں حقیقت حال کا اظہار ہے۔ اوپر خاندان عمران کا شجرہ، حضرت مریمؑ کی ولادت اور ان کے بارے میں ان کی ماں کی نذر، حضرت زکریاؑ کی بیٹے کے لئے دعا اور حضرت یحییٰؑ کی ولادت کے واقعات جو بیان ہوئے ہیں سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کی تمہید و تقریب کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔ اب آگے یہ بیان ہو رہا ہے کہ جس طرح فرشتے نے حضرت زکریاؑ کو بیٹے کی بشارت دی تھی اسی طرح فرشتے نے حضرت مریمؑ کو بھی بشارت دی کہ ان کے ہاں اللہ کے کلمہ 'کن' کے ذریعے سے ایک فرزند کی ولادت ہوگی جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ جس طرح حضرت یحییٰؑ کے بابت ارشاد ہوا کہ وہ سردار، ضابط، نبی اور صالح ہوں گے اسی طرح عیسیٰ بن مریم کے بابت فرمایا کہ دنیا اور آخرت دونوں میں باوقار، مقرب اور صالح ہوں گے۔ پھر جس طرح حضرت زکریاؑ نے اپنے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ پن کے باعث اس بشارت پر تعجب کا اظہار کیا اسی طرح حضرت مریمؑ نے بھی تعجب کا اظہار فرمایا کہ جب انہیں کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا تو انہیں اولاد کس طرح ہوگی۔ فرشتے نے

جو جواب حضرت زکریا کو دیا تھا وہی جواب حضرت مریمؑ کو دیا کہ اصل چیز اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اس کو ہو جانے کا حکم دیتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی کلمہ کن کے ذریعہ سے وہ مسیح عیسیٰ بن مریم کو پیدا کرے گا اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا اور ان کو بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول بنا کر بھیجے گا۔

اس کے بعد تین آیتوں میں حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے وہ ابتدائی پیغام ہے جو انہوں نے اپنی رسالت کے اثبات اور اس کے مقصد کے اظہار کے طور پر بنی اسرائیل کو دیا ہے۔

پھر دو آیتوں میں اس امر کا بیان ہے کہ جب بنی اسرائیل کے علماء اور فقیہوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے آپ کو مایوس کر دیا تو آپ نے ان کو چھوڑ کر ان غریبوں کو اپنا معتمد ساتھی بنایا جو ان پر ایمان لا تے تھے اور انہی کو اللہ کے دین کی نصرت وحمایت کے لئے کمر بستہ ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ یہی غریب لوگ آپ کے ساتھی بنے اور حضرتؑ نے انہی کو تبلیغِ دین کی مہم پر روانہ کیا۔

اس کے بعد چار آیتوں میں اس ردعمل کا ذکر ہوا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی اس آخری کوشش کا بنی اسرائیل کے لیڈروں، فقیہوں اور فریسیوں پر ہوا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی مدد فرمائی اور آئندہ مدد فرمانے کا وعدہ کیا اس کا حوالہ ہے۔

اس کے بعد پانچ آیتیں التفات کی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ واضح فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اصل حقیقت یہ ہے جو بیان ہوئی ہے۔ اگر اس وضاحت کے بعد بھی نصاریٰ تم سے حجت کرتے رہیں تو ان سے کہو کہ آؤ مباہلہ کریں، اگر وہ اس سے بھی گریز کریں تو سمجھ لو کہ یہ پکے مفسد ہیں، ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو ——

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت کیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝٤٥ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصّٰلِحِينَ ۝٤٦ قَالَتْ رَبِّ أَنّٰى يَكُونُ لِي

وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا
يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۞ ۴۷ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۞ ۴۸
وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ
الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ
الْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ
بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞ ۴۹ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ
يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ
مِّنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۞ ۵۰ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا
صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۞ ۵۱ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ
قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۞ ۵۲ رَبَّنَآ
اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۞ ۵۳ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ
اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۞ ۵۴ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ
اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ
تَخْتَلِفُوْنَ ۞ ۵۵ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۞ ۵۶ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۞ ۵۷ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۞ ۵۸ اِنَّ
مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۞ ۵۹
اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۞ ۶۰ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا
جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا
وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۞ ۶۱ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ
الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞ ۶۲ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ ۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۞ ۶۳ ۔

یاد کرو جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تمہیں اپنی طرف سے ایک کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں ذی وجاہت اور اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہوگا۔ وہ لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرے گا اور ادھیڑ ہو کر بھی اور وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوگا۔ وہ بولی کہ اے میرے پروردگار میرے کس طرح لڑکا ہوگا جب کہ کسی مرد نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ارشاد ہوا، اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ جب وہ کسی امر کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور حکمت، تورات اور انجیل سکھائے گا اور اس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔ چنانچہ اس نے بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ میں تمہارے خداوند کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں ——— میں تمہارے لئے مٹی سے پرندوں کی صورت کے مانند صورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مار دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے واقعی پرندہ بن جاتی ہے اور میں اللہ کے حکم سے اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں اور میں تمہیں بتا سکتا ہوں جو کچھ تم کھاتے اور ذخیرہ کرتے ہو اپنے گھروں میں۔ بے شک ان باتوں کے اندر تمہارے لئے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو۔ اور میں تصدیق کرتا ہوا آیا ہوں اپنے سے پیشتر سے آئی ہوئی تورات کی اور اس لئے آیا ہوں کہ بعض ان چیزوں کو تمہارے لئے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں اور میں تمہارے پاس تمہارے خداوند کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے، تمہارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔ ۴۵-۵۱

پس جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے کفر کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار اور آپ گواہ رہیئے کہ ہم مسلم ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے اس چیز پر جو تو نے اتاری اور ہم نے رسول کی پیروی کی سو تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ۔ ۵۲-۵۳

اور انہوں نے خفیہ چالیں چلیں تو اللہ نے بھی ان کا خفیہ توڑ کیا اور اللہ بہترین توڑ کرنے والا ہے۔ جبکہ اللہ نے کہا کہ اے عیسیٰ میں تمہیں قبض کر لینے والا اور اپنی طرف اٹھا لینے والا

ہوں اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان سے تمہیں پاک کرنے والا ہوں ۔ جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ہے ان کو قیامت تک کے لئے ان لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں جنہوں نے تمہارا انکار کیا ہے ۔ پھر میری طرف تم سب کا پلٹنا ہوگا اور میں تمہارے درمیان ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کو سخت عذاب دوں گا ، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ، اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے تو ان کو ان کا پورا اجر دے گا اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا ۔ ۵۴ ۔ ۵۷ ؏

یہ ہم تمہیں سنا رہے ہیں اپنی آیات اور اپنی پر حکمت یاد دہانی میں سے ۔ عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے ۔ اس کو مٹی سے بنایا ، پھر اس کو امر کیا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا ۔ یہی بات تمہارے رب کی طرف سے حق ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو ۔ سو جو تم سے اس بارے میں حجت کریں بعد اس کے کہ تمہارے پاس صحیح علم آچکا ہے تو ان سے کہو کہ آؤ ، ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں ، تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ ، ہم اپنی عورتوں کو جمع کریں ، تم اپنی عورتوں کو جمع کرو ، ہم اپنے آپ کو اکٹھا کریں ، تم اپنے آپ کو اکٹھا کرو ، پھر ہم مل کر دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت بھیجیں ۔ بے شک یہی سچا بیان ہے ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ ہی عزیز اور حکیم ہے ۔ پس اگر وہ اعراض کریں تو اللہ مفسدوں کو خوب جانتا ہے ۔ ۵۸ ۔ ۶۳

۱۴۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ۴۵

'اِذْ' کا اعادہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں جو بات کہی جا رہی ہے یہ اس سے الگ ہے جو اوپر کہی گئی ۔ پہلے حضرت مریمؑ کو دعا اور عبادت میں مشغول ہو جانے کی تاکید ہوئی پھر کچھ عرصے کے بعد فرشتہ یہ بشارت لے کر حضرت مریمؑ کے پاس آیا ۔

'کلمہ' کا مفہوم اور اس کے نکرہ لانے کا فائدہ اوپر بیان ہو چکا ہے ۔ یہاں موقع

کی روایت سے ایک نکتہ توجہ کے لائق ہے۔ وہ یہ کہ اصل بشارت تو یہ تھی کہ حضرت مریمؑ کے ہاں بغیر مرد کی ملاقات کے مجرد اللہ تعالیٰ کے امر و حکم سے ایک بیٹا ہوگا لیکن بات حضرت مریمؑ سے کہی جا رہی تھی جو کنواری بھی تھیں اور شرم و حیا کی پیکر بھی۔ اس وجہ سے نہایت اختصار بلکہ ابہام کے ساتھ صرف کلمہ کی بشارت دی گئی۔ البتہ آگے حضرت عیسیٰؑ کے نام اور صفات کے ذکر سے بات واضح ہوگئی کہ کلمہ سے مراد کیا ہے۔

"مسیح" حضرت عیسیٰؑ کا لقب ہے۔ لقب کے لئے قاعدہ یہی ہے کہ نام سے پہلے اس کو لاتے ہیں۔ بنی اسرائیل میں یہ روایت رہی ہے کہ ان کے ہاں جو نبی ہونے والا ہوتا اس کے سر پر اس کا پیشرو نبی ایک قسم کا مقدس تیل مل کر اس کو اپنا جانشین بناتا۔ جب نبوت کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں بادشاہی کا سلسلہ شروع ہوا تو مسح کرنے کی یہی روایت بادشاہوں کے لئے بھی اختیار کی گئی۔ جو وقت کا نبی ہوتا وہ ہونے والے بادشاہ کے سر پر مقدس تیل ملتا جس سے واضح ہو جاتا کہ یہ مستقبل کا بادشاہ بھی ہے اور خدا کا برگزیدہ بھی۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت اور حضرت داؤدؑ کو سموئیل نبی نے اسی طرح مامور کیا تھا۔ حضرت مسیحؑ کے بارے میں انجیلوں سے یہ تو ثابت ہے کہ حضرت یحییٰؑ نے ان کو بپتسمہ دیا لیکن تیل ملنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ پیدائشی مسیح تھے۔ بخاری شریف میں ان کا جو حلیہ بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سر کا حال یہ تھا کہ گویا اس سے تیل ٹپک رہا ہے۔ ممکن ہے ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے ان کو مسیح کا لقب عنایت ہوا ہو۔ انجیل میں ان کے لئے "خدا کا مسیح" کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

"وجیہ" کے لفظ سے ایک تو اس سرداری کی شان کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جس کا ذکر اوپر حضرت یحییٰؑ کے بیان میں گزر چکا ہے۔ لوقا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ سال کی عمر میں حضرت مسیحؑ نے پہلی بار ہیکل میں تعلیم دی لیکن اس کمسنی کے باوجود ان کی تعلیم کی حکمت و معرفت، کلام کی بلاغت و جزالت اور لب و لہجہ کی عظمت و جلالت کا عالم یہ تھا کہ فقیہ اور فریسی، سردار کاہن اور ہیکل کا تمام عملہ دم بخود رہ گیا۔ وہ حیرانی کے عالم میں ایک ایک سے پوچھتے پھرتے تھے کہ یہ کون ہے جو اس شکوہ سے بات کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان

سے اس کو اختیار ملا ہوا ہے۔ یہودیہ کی بستیوں میں جب انہوں نے تبلیغ شروع کی تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل مچ گئی۔ خلقت ان پر ٹوٹی پڑتی تھی۔ فقیہ اور فریسی سب پر ایک سراسیمگی کا عالم تھا، وہ ان کو زچ کرنے اور عوام میں ان کی مقبولیت کم کرنے کے لئے ان سے طرح طرح کے سوالات کرتے لیکن سیدنا مسیح دو دو لفظوں میں ان کو ایسے دندان شکن جواب دیتے کہ پھر ان کو زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی وجاہت کا یہ غلغلہ ہوا کہ عوام ان کو اسرائیل کا بادشاہ کہنے اور ان کی بادشاہی کے گیت گانے لگے، یہاں تک کہ رومی حکام ہیرودیس اور پیلاطوس کے سامنے بھی یہ مسئلہ ایک نہایت اہم مسئلہ کی حیثیت سے آگیا لیکن وہ بھی اپنی تمام قوت وجبروت کے باوجود سیدنا مسیح کی عظمت وصداقت اور ان کی بے پناہ مقبولیت سے مرعوب ہوگئے۔

اس وجاہت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ باوجودیکہ سیدنا مسیح بن باپ کے پیدا ہوئے اور بن باپ کے پیدا ہونے والے کسی بچے کے لئے عام حالات میں کسی عزت و وجاہت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن سیدنا مسیح چونکہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کن" سے پیدا ہوئے تھے اس وجہ سے اس کا معجزانہ اثر یہ ظاہر ہوا کہ روزِ اوّل سے ان کو خلق کی نگاہوں میں وہ وجاہت حاصل رہی جو اس عہد میں کسی کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ زندگی بھر اپنے جانی دشمنوں میں گھرے رہے لیکن اس پہلو سے کسی کو ان پر طعن کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہود کے ایک گروہ نے اگر جسارت بھی کی تو بعد کے زمانوں میں کی، ان کے عہد مبارک میں کسی کو بھی اس قسم کی جرأت نہ ہوسکی۔ ان کی اس وجاہت کی بشارت ان کی ولادت کے بشارت کے ساتھ ہی حضرت مریم کو اس لئے دی گئی کہ ان کو اس پہلو سے کوئی خلجان نہ ہو کہ بن باپ کے پیدا ہونے کے سبب سے بچے کی یا خود ان کی وجاہت پر کوئی اثر پڑے گا۔

اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے ان تمام خرافات کی تردید ہو رہی ہے جو انجیلوں میں مذکور ہیں کہ یہودیوں نے سیدنا مسیح کے نعوذ باللہ طمانچے لگائے، ان کا مذاق اڑایا، ان کو گالیاں دیں۔ ان کے منہ پر تھوکا۔ ان خرافات کا اکثر حصہ، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے، غلط ہے۔ اللہ کے رسولوں کے دشمن ان کی توہین و تحقیر کی جسارت تو کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک

حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ڈھیل بھی مل جاتی ہے لیکن یہ ڈھیل بس ایک خاص حد تک ہی ہوتی ہے۔ جب کوئی قوم اس حد سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے اور اس ناہنجار قوم کا بیڑا غرق کر دیا جاتا ہے۔ آگے اس سنت اللہ کی ہم وضاحت کریں گے۔

اس آیت میں حضرت عیسیٰ کو ابن مریم کہہ کر قرآن نے ان لوگوں کے لئے گفتگو کی ہر گنجائش ختم کر دی ہے جو نہایت کمزور تاویلات کے ذریعے سے قرآن کے نہایت واضح نصوص کی تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ اگر حضرت عیسیٰ کسی باپ کے بیٹے تھے تو آخر قرآن کو مسیح بن مریم کہنے کے بجائے ان کے باپ کی طرف ان کی نسبت کرنے میں کیا رکاوٹ تھی؟ قرآن بھی مسیح بن یوسف کہہ سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ آخر کیوں نہیں کہا؟

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴٦﴾

سیدنا مسیح کا گہوارے میں بات کرنا حضرت مریم کی پاکدامنی کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ تھا۔ اس معجزے کی بشارت بچے کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ہی حضرت مریم کو اس لئے دے دی گئی کہ وہ مطمئن رہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگر اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لئے ان کو واسطہ بنایا ہے تو ان کے ناموس کو اعدا کی بدزبانیوں سے بچانے کے لئے بھی اس نے ایسا انتظام فرمایا ہے کہ کسی تہمت کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ اپنی ایک مومنہ و قانتہ بندی کو ساری خدائی کی تہمتوں کا ہدف بنا دے اور اس کی مدافعت میں کوئی ایسی زبان نہ کھولے جو سب کی زبانیں بند کر دے۔

«کہل» کے معنی ادھیڑ کے ہیں۔ موجودہ انجیلوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ادھیڑ ہونے سے بہت پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن قرآن کی اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو ضمناً حضرت عیسیٰ کے کہولت تک پہنچنے کی بھی بشارت دی گئی تھی۔ رسولوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت رہی ہے اس کے لحاظ سے یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ انجیل میں بھی بعض اشارات اس کی تائید میں ہیں۔ مثلاً یوحنا ۸ : ۵۷ میں ہے۔

"اور یہودیوں نے اس سے کہا تیری عمر تو ابھی پچاس برس کی بھی نہیں ہے
پھر کیا تو نے ابرہام کو دیکھا ہے"؟

ظاہر ہے کہ یہ بات ایسے ہی شخص کو مخاطب کر کے کہی جا سکتی ہے جو پچاس سال کے قریب پہنچ رہا ہو۔

گہوارے ہی کلام کے ساتھ ان کے کہولت کے کلام کا حوالہ دینے سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ان کی گہوارے کی بات بچوں کی سی نہیں ہوگی بلکہ اس کے اندر بھی پختہ سن وسال کی دانائی ہوگی ۔ اس لئے کہ یہ بات من جانب اللہ ہوگی۔

آخر میں "وَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ" فرما کر، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ واضح کر دیا کہ وہ صالحین کے زمرے ہی سے ہوں گے یعنی ان تمام کمالات و اوصاف کے باوجود یہ نہیں ہے کہ ان کو الوہیت کا کوئی درجہ حاصل ہو جائے ۔ پس وہ اللہ کے صالح بندوں ہی سے ہوں گے۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾

آیت ۴۰ کے تحت اس آیت کے اہم اجزا کی وضاحت گزر چکی ہے ۔ البتہ اس میں اس کلمہ کی وضاحت بھی ہو گئی ہے جس سے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی ۔ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔ (اللہ جب کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کو حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے)

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾

تورات اور انجیل کے الفاظ یہاں کتاب اور حکمت کی تفسیر کے طور پر ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان دونوں چیزوں کی تعلیم دے گا ۔ سیدنا مسیحؑ جہاں تک کتاب و شریعت کا تعلق ہے حضرت موسیٰؑ کی شریعت ہی کے پیرو اور داعی تھے ، وہ تورات سے کوئی الگ شریعت لے کر نہیں آئے تھے ۔ اس حقیقت کا اعلان بار بار بڑے زور اور تاکید کے ساتھ انہوں نے خود فرمایا ہے ۔ انجیلوں میں ان کی تصریحات موجود ہیں ۔ البتہ انہوں نے اس شریعت کی روح اور اس کی حکمت نہایت معجزانہ انداز میں بے نقاب فرمائی ہے اور اناجیل درحقیقت

ان کی انہی حکمتوں کا مجموعہ ہیں۔ یہود نے تورات کو بالکل بے روح احکام اور بے جان رسوم کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا تھا اس وجہ سے ان کی شریعت زندگی سے بالکل خالی ان کے لئے صرف ایک بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔ حضرت مسیحؑ نے اس کے اندر اپنی تعلیم حکمت سے زندگی پیدا کی لیکن یہود نے اس کی قدر نہ کی۔

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ○ (۴۹)

'رَسُولًا' سے پہلے ایک فعل محذوف ہے۔ یعنی یبعثہ رسولاً۔ سیدنا مسیحؑ حضرت یحییٰؑ کی طرح صرف ایک نبی نہیں تھے بلکہ جس طرح حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اسی طرح یہ بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے رسول اور نبی میں فرق ہوتا ہے۔ رسول جس قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے اس کے لئے خدا کی عدالت بن کر آتا ہے۔ اس کے ہاتھوں لازماً اس قوم کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ایمان لاتی ہے تو نجات پاتی ہے اور اگر اپنے کفر پر اڑی رہ جاتی ہے اور اپنے نبی کو گزند پہنچانے کی کوشش کرتی ہے تو فنا کر دی جاتی ہے۔ اس حقیقت کی طرف حضرت یحییٰؑ نے مختلف اسلوبوں سے اشارہ فرمایا تھا۔ مثلاً یہ کہ 'میں تو تمہیں پانی سے بپتسمہ دے رہا ہوں، جو آ رہا ہے وہ تمہیں آگ سے بپتسمہ دے گا'۔ یا یہ کہ 'اب درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے'۔ یا یہ کہ 'اس کے ہاتھ میں اس کا چھاج ہوگا اور وہ اپنے کھلیان کو اچھی طرح پھٹکے گا اور گندم کو بھس سے علیحدہ کرے گا'۔ اس کی پوری تفصیل دوسرے مقام میں آئے گی۔

اس سے حضرت عیسیٰؑ کی رسالت کا بنی اسرائیل کے لئے خاص ہونا بھی واضح ہو گیا۔ سیدنا مسیحؑ کا خود اپنا اعلان بھی یہی ہے۔ انہوں نے جب اپنے حواریوں کو تبلیغ دین کی مہم پر روانہ کیا تو اُن کو غیر بنی اسرائیل کی طرف جانے سے نہایت صاف لفظوں میں روک دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ 'میں صرف اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں ہی کی تلاش کے لئے آیا ہوں'۔ ایک غیر اسرائیلی عورت

ان سے دعائے شفا کی طالب ہوئی تو انہوں نے اس جواب میں بھی یہی کہا کہ "بچوں کے حصے کی روٹی کتوں کے آگے ڈالنا ٹھیک نہیں"۔ انجیل میں ضیافت والی جو تمثیل ہے اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ آپ کی دعوت جن معروفات پر مبنی تھی یہ معروفات بنی اسرائیل کے لئے دلیل و حجت بن سکتے تھے لیکن دوسری قوموں کے لئے ان کا سمجھنا ممکن نہ تھا۔ اس وجہ سے یہ دعوت اپنی فطرت ہی کے لحاظ سے دوسری قوموں کے لئے بالکل ناموزوں تھی۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ دوسری قوموں نے، جن کے سامنے یہ دعوت پیش کی گئی، اُس کو بالکل نہیں سمجھا۔ انہوں نے انجیلوں سے بس یہ سمجھا کہ حضرت عیسیٰؑ نے بے شمار معجزے دکھائے ہیں۔ اس کا جو اثر ان پر پڑا وہ یہ کہ انہوں نے ان معجزات کے بل پر ان کو ایک معبود بنا کر رکھ دیا۔

اِنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ - یہاں "رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ" کے بعد حضرت مسیحؑ کی سرگذشت کا وہ سارا حصہ حذف ہے جو اس بشارت اور ان کے عملاً بنی اسرائیل کے سامنے دعوت رسالت لے کر اُٹھنے کے درمیان کی مدت سے تعلق رکھنے والا ہے۔ قرآن نے انبیاء علیہم السلام کی سرگزشتوں کے بیان میں حذف کا یہ طریقہ بہت استعمال کیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاری کی توجہ کلام کے اصل مقصد پر مرکوز رہتی ہے، کوئی زائد چیز بیچ میں مخل نہیں ہونے پاتی۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ ان کے مقصد بعثت کو واضح کر دینے کے بعد گویا اُن کو داعی بنا کر بنی اسرائیل کے سامنے کھڑا کر دیا کہ انہوں نے اُن کو یہ دعوت دی اور اپنی رسالت کے ثبوت میں یہ نشانیاں دکھائیں۔

یہاں جو معجزات مذکور ہیں ان میں سے پہلے اور آخری کے سوا انجیل میں بھی سب مذکور ہیں البتہ قرآن میں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ باذن اللہ کی قید لگی ہوئی ہے لیکن انجیل میں اس قسم کی تصریحات غائب ہیں۔ اس لئے کہ جب حضرت عیسیٰ کیلئے خدا کا تصور پیدا ہوا ہو گا تو اس قسم کے الفاظ خدائی کے تصور سے بے جوڑ سمجھ کر نکال دیئے گئے ہوں گے۔ لیکن یہ لوگ کہاں کہاں حقائق کو چھپاتے۔ ان کی ساری کوششوں کے علی الرغم آج بھی انجیلوں میں توحید خالص کی ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ان روشن شواہد کے ہوتے ہوئے نصاریٰ

شرک میں کس طرح مبتلا ہو گئے۔؟ آگے بعض چیزوں کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

تنکیر وحدت نہیں تعمیم کیلئے

'جئتکم بآیۃ' لفظ آیت کی تنکیر وحدت کو نہیں بلکہ تعمیم کو ظاہر کرتی ہے۔ یعنی میں اپنی رسالت کے ثبوت میں اپنے ربّ کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ اس سے قطع نظر کی ان کی تعداد کیا ہے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝

مصدقاً لما بین یدی کا مفہوم

'مُصَدِّقًا' ہے تو حال لیکن یہ محض معنوی مشابہت کی وجہ سے سابق جملے پر عطف ہو گیا ہے۔ اس کے دو مفہوم ہیں اور ان دونوں مفہوموں کی دوسرے مقام میں ہم وضاحت کر چکے ہیں۔ ایک یہ کہ میں تورات کی تصدیق کرتا ہوں۔ اس تصدیق کے شواہد انجیلوں میں موجود ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے بڑے زور اور بڑی تاکید کے ساتھ یہ بات بار بار فرمائی ہے کہ 'میں تورات کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ اس کو قائم کرنے آیا ہوں'۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن اس کا (تورات) ایک نقطہ بھی نہیں ٹل سکتا جب تک ہر بات پوری نہ ہو لے'۔ انہوں نے عملاً جس شریعت کی خود پیروی کی اور جس کی پیروی کی ہدایت اپنے پیرووں کو دی وہ تورات ہی کی شریعت تھی۔ انہوں نے تورات پر جو اضافہ فرمایا ہے وہ شریعت کا نہیں بلکہ صرف حکمت کا ہے اور اس اضافے کی نوعیت یہ ہے کہ انہوں نے تورات کے اس باطن کو کھول دیا ہے جس سے یہود کے علما اور فریسیوں کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کے نام لیواؤں نے تورات سے بغاوت کا اعلان تو پال کے زمانے سے کیا ہے۔

دوسرا یہ کہ میں تورات کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہوں، میرے ظہور سے ان کی تصدیق ہوئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیشرو نبیوں سے ایسی پیشین گوئیاں موجود تھیں جن کی بنا پر یہود کو ایک نبی کی بعثت کا انتظار تھا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کی شہرت ہوئی تو بہت سے حلقوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ جس کا انتظار تھا وہ آگیا۔ بعض لوگ اس منتظر کا نام ایلیا بتاتے تھے۔ انجیلوں میں حضرت یوحنا کے متعلق بھی منقول ہے کہ جب وہ ہیرودیس کے حکم سے جیل میں تھے تو انہوں نے اپنے چند شاگردوں کو حضرت مسیحؑ کی خدمت میں بھیج کر پچھوایا کہ "وہ جس کا انتظار

تو یہی ہے، یا ہم کسی اور کا انتظار کریں"؟ حضرت مسیحؑ نے پیغام لانے والوں سے کہا کہ جو کچھ دیکھ رہے ہو وہ جا کر بتا دو کہ "لنگڑے چل رہے ہیں۔ گونگے بول رہے ہیں، اندھے دیکھ رہے ہیں، اب اور کس بات کا انتظار ہے"؟ حضرت عیسےٰ علیہ السلام نے متعدد ایسی باتوں کا خود بھی حوالہ دیا ہے جو ان کے بارے میں پچھلے نبیوں نے فرمائی ہیں۔ یہ حوالے انجیلوں میں موجود ہیں۔

وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ۔ یہ جملہ بھی معنی پر عطف ہے۔ بعض حرام کردہ چیزوں کے حلال کرنے سے ان چیزوں کو حلال کرنا مراد ہے جو علمائے یہود نے محض اپنے من گھڑت فتووں اور اپنے غلو کی وجہ سے حرام کر رکھی تھیں اور یہ چیزیں روایت بن کر شریعت میں داخل ہو گئی تھیں۔ مثال کے طور پر سبت کے احترام کے مسئلہ کو لیجئے۔ اس حکایت کو یہود کے فقیہوں اور فریسیوں نے اس قدر بڑھا دیا تھا کہ سبت کے دن کسی مریض کو شفا کی دُعا دینا بھی ان کے نزدیک احترامِ سبت کے منافی تھا، چنانچہ احترامِ سبت کے مسئلے پر حضرت مسیحؑ اور علمائے یہود کے درمیان متعدد مناظروں کا ذکر انجیلوں میں بھی ہے۔ اسی طرح متعدد ایسی روایات کا بھی انجیلوں میں ذکر ہے جن کو سیدنا مسیحؑ اور ان کے شاگردوں نے علانیہ توڑا، اور جب ان کے توڑنے پر علمائے یہود نے ان پر بے دینی کا الزام لگایا تو آپ نے ان کی اس جھوٹی دینداری کی اچھی طرح قلعی کھول دی۔

[illegible]

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ؁۵۱

لفظ اب کی اصل حقیقت

انجیلوں میں خُدا کے لئے "میرا باپ اور تمہارا باپ" کی جو تعبیر بار بار آئی ہے یہ قرآن نے اس کی تصحیح فرمائی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دراصل جو بات فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، سو اسی کی بندگی کرو۔ لیکن نصاریٰ نے متشابہات کی پیروی کی اور آپؑ کی واضح تعلیمات کو نظر انداز کر دیا۔ عبرانی میں 'اب' کا لفظ باپ اور رب دونوں معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح ابن کا لفظ بیٹے اور عبد' دونوں معنوں میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو سیاق و سباق متعین کرتا ہے کہ لفظ کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے لیکن جب نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا عقیدہ بنا لیا تو جو چیز بھی انہیں مفید مطلب نظر آئی اس کو انہوں نے کس عقیدے کی تائید میں استعمال کر لیا قطع نظر اس سے کہ اس کا موقع و محل کیا ہے۔ پھر جب اصل انجیل کی جگہ صرف اس کے ترجمے

رہ گئے تو ہر چیز کی تعبیر بھی یک قلم بدل کے کچھ سے کچھ ہو گئی۔ لیکن ان ساری تحریفات کے باوجود آج بھی انجیل میں ایسی تصریحات موجود ہیں جن سے صاف واضح ہے کہ حضرت مسیحؑ خدا کو 'اب' کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد 'رب' ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض مقامات میں انہوں نے دوسرے مترادف اس لفظ کے استعمال کر کے مطلب کو بالکل واضح کر دیا ہے چنانچہ یوحنا باب ۲۰ : ۱۸ میں ہے:-

"لیکن میرے بھائیوں کے پاس جا کر ان سے کہہ کہ میں اپنے باپ
اور تمہارے باپ اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر
جاتا ہوں"

اس ارشاد سے صاف واضح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جس معنی میں اللہ تعالیٰ کو 'اب' کہتے ہیں اس معنی میں وہ اس کو تمام خلق کا 'اب' کہتے ہیں اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ وہ اس لفظ کو اللہ تعالیٰ کی تعبیر کے لئے اس کی ربوبیت کے پہلو سے استعمال کرتے ہیں نہ کہ اس کے ساتھ اپنا نسبی رشتہ جوڑنے کے لئے۔ علاوہ ازیں وہ خدا کے لئے خدا کی تعبیر بھی استعمال کرتے ہیں اور اس کو جس طرح دوسروں کا خدا کہتے ہیں اسی طرح اس کو اپنا بھی خدا کہتے ہیں۔

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ یعنی خدا تک پہنچنے کی سیدھی راہ یہی ہے کہ اسی کو سب کا رب مانا جائے، اپنا بھی اور دوسروں کا بھی اور اُسی کی عبادت کی جائے جن لوگوں نے دوسرے وسیلے اور واسطے بیچ میں پیدا کر لئے ہیں انہوں نے اس سیدھی راہ میں بہت سے کج پیچ پیدا کر لئے ہیں جس کے سبب سے وہ شرک و گمراہی کی وادیوں میں بھٹک گئے ہیں۔ یہ راہ بغیر کسی کجی (عوج) کے ہے، یہ سیدھی خدا تک پہنچاتی ہے۔ نکرہ یہاں اس شاہراہ فطرت کی اہمیت و شان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ ۵۲-۵۳

'حواری' کا لفظ عربی میں عبرانی سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے لغوی مفہوم میں اہل لغت

صراط مستقیم

حواری کا مفہوم

کا اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے معنی خیر خواہ، حامی، ناصر اور مددگار کے ہیں جس طرح لفظ انصار مدینہ کے ان جاں نثاروں کے لئے خاص ہوا جنہوں نے ابتدائے دعوت ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اسی طرح 'حواریین' کا لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اُن خاص شاگردوں کے لئے استعمال ہوا جو آپ پر ایمان لائے، ہر قسم کے نرم و گرم حالات میں آپ کے ساتھ رہے؛ آپ نے پوری شفقت اور دل سوزی سے شب و روز جن کی تعلیم و تربیت کی اور جو بالآخر آپ کے داعی، نقیب اور آپ کے پیغام بر بن کر بنی اسرائیل کی ایک ایک بستی میں پہنچے۔ ان شاگردوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ انجیل میں موجود ہے۔

"انصار" ناصر کی بھی جمع ہے اور نصیر کی بھی، معنی واضح ہیں۔ ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، معنی کے اعتبار سے انصار اور حواریین کے لفظ میں کچھ ایسا فرق نہیں ہے۔ چنانچہ اسی اشتراکِ معنوی کے پہلو سے حواریین کو قرآن نے، جیسا کہ ہم سورہ صف میں بتائیں گے، انصارِ مدینہ کے سامنے بطورِ مثال پیش کیا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے علماء اور سرداروں کے رویے سے یہ محسوس کر لیا کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں تو انہوں نے اپنی ساری توجہ اپنے ان غریب ساتھیوں کی طرف پھیر دی جو اگرچہ منصب و جاہ نہیں رکھتے تھے لیکن دولتِ ایمان سے متمتع تھے۔ انبیاء علیہم السلام کی یہ سنت رہی ہے کہ اوّل اوّل تو انہوں نے اپنی اپنی قوموں کے بااثر لوگوں کو جھنجھوڑنے اور جگانے کی کوشش کی ہے لیکن جب انہوں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ یہ خوابِ غفلت کے ماتے لوگ کروٹ بدلنے والے نہیں ہیں تو انہوں نے ان سرمستوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنی ساری توجہ اپنے غریب باایمان ساتھیوں پر مرکوز کر دی ہے۔ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار سے اعراض کرنے اور اہلِ ایمان کو تذکیر کرنے کی جو بار بار ہدایت ہوئی ہے وہ اسی مرحلے کی بات ہے۔ اور یہی مرحلہ ہے جس میں سیدنا مسیحؑ نے دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے مچھلیوں کے پکڑنے والو آؤ، میں تمہیں آدمیوں کا پکڑنے والا بناؤں۔

اس آیت سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ حالات

کے بگاڑ اور قوم کی ہٹ دھرمی سے مایوس اور دل شکستہ نہیں ہوتے ۔ بلکہ خدا کی راہ میں وہ اپنی جدوجہد جاری رکھتے ہیں۔ اگر زور و اثر رکھنے والے لوگ ان کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ اپنے غریب، وفادار اور کمزور و بے اثر ساتھیوں ہی کو لے کر اپنا سفر شروع کر دیتے ہیں ۔ حالات کی تاریکی ان کے اندر روشنی اور قوم کی بے مہری ان کے اندر مزید قوت اور عزم پیدا کرتی ہے ۔

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

سورہ نوحؑ کی تفسیر میں انبیا کے کردار کے اس پہلو پر انشاء اللہ ہم تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے ۔

(دعوت الی اللہ کا مفہوم)

مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ، سے ایک طرف تو اس جوشِ دعوت کا اظہار ہو رہا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے دوسری طرف ان کے اس اقدام اور اس عزم و جزم کا اظہار ہو رہا ہے جو اللہ کے سوا ہر معیت و رفاقت سے بالکل بے نیاز ہوتا ہے ۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دعوت کی اس للکار میں یہ مضمون بھی مضمر ہے کہ میں تو اپنے رب کی راہ پر، یہ دیکھو، چل پڑا ہوں، اب جس کے اندر حوصلہ ہو وہ اس وادی پُرخار میں میرا ساتھ دے ۔

[illegible]

نبی کا یہ فیصلہ کن عزم مُردوں کے اندر بھی زندگی کی لہر دوڑا دینے کا اثر رکھتا ہے جن روحوں کے اندر کچھ صلاحیت ہوتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ بیدار ہو جاتی ہیں بلکہ تڑپ اٹھتی ہیں اور جب تڑپ اٹھتی ہیں تو برسوں کی منزل لمحوں میں طے کر لیتی ہیں۔ جو لوگ عربی کے ادا شناس ہیں ان کے لئے یہاں ایک نکتہ قابلِ ذکر ہے ۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو فرمایا کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ، لیکن حواریین نے جو جواب دیا وہ یہ نہیں ہے کہ نَحْنُ اَنْصَارُنَا اِلَی اللّٰہِ بلکہ بے دھڑک جواب دیا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ۔ سیدنا مسیحؑ کے ارشاد میں 'الیٰ' اس مسافت کو واضح کر رہا ہے جو راہ اور منزل کے درمیان واقع ہے اور ایک داعی کی حیثیت سے ان کے شایانِ شان یہی تھا کہ اس راہ کی مشکلات اور درمیان کی مسافت سے آگاہ کر دیں لیکن حواریین نے اپنے جواب میں جوشِ فدویت کی ایک ہی جست میں گویا ساری مسافت طے کر لی ہے ۔ اور دعوتِ حق کے اس نازک مرحلے میں ان کے جذبہ ایمان و اسلام کے شایانِ شان بات یہی تھی۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ حضرت مسیحؑ کے سوال میں تو بڑا اختصار ہے لیکن حواریین کے جواب میں بڑی تفصیل ہے - انہوں نے اپنے ایمان کا بھی اقرار کیا، اپنے مسلم ہونے پر بھی حضرت مسیحؑ کو گواہ ٹھہرایا، اور اپنے ایمان و اتباعِ رسوؑل کے اقرار کے ساتھ خُدا سے دُعا بھی کی کہ ان کو حق کی شہادت دینے والوں میں لکھا جائے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حواریین اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اللہ کے انصار میں سے ہونے کے معنی کیا ہیں اور یہ اجمال کن تضمنات و مضمرات پر مشتمل ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کے تقاضوں میں سے یہ ہے کہ خُدا پر صدقِ دل سے ایمان لایا جائے، اس کے جملہ احکام کی بے چون و چرا پیروی کی جائے، جو کچھ اس نے اتارا ہے اس کو مانا جائے، اس کے بھیجے ہوئے رسُول کی پیروی کی جائے اور قول، عمل، زندگی اور موت سے اس حق کی شہادت دی جائے جس کا خدا نے امین بنایا ہے۔ یہی وہ شہادت ہے جو اگر جان دے کر دی جائے تو اصل شہادت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھیئے کہ حواریین نے سیدنا مسیحؑ کو جس چیز پر خاص طور پر گواہ ٹھہرایا ہے وہ اپنا مسلم ہونا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ حواریین کے ذہن میں صرف اسلام اور مسلم کا تصوّر تھا، نصاریٰ اور نصرانیّت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ بات اس سورہ کے عمود سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم سورہ کے تمہیدی مباحث میں واضح کر چکے ہیں کہ اس سورہ کا عمود اسلام ہے۔

فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ، یہ اس بات کی دُعا ہے کہ قیامت کے روز ان کا شمار حق کی شہادت دینے والوں میں لکھا جائے، حق کو چھپانے والوں میں نہ لکھا جائے۔ یہی شہادتِ حق وہ اصل ذمّہ داری ہے جو ہر نبی کی امّت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی جاتی ہے۔ نبی، جان کی بازی لگا کر امت پر اللہ کے دین کی گواہی دیتا ہے اور نبی کے بعد یہ امت کی ذمّہ داری ہوتی ہے کہ اس حق کی گواہی، ہر طمع اور ہر خوف سے بے پروا ہو کر، خلق پر دے۔ یہ گواہی دل، زبان، قول، عمل اور جان و مال کی قربانی، ہر پہلو سے دینے کا مطالبہ ہے۔ اس شہادت کا ضد کتمانِ حق ہے جو شریعتِ الٰہی کے شدید ترین جرائم میں سے ہے۔ مذاہب کی تاریخ سے ثابت ہے کہ یہود اس جرم کے سب سے بڑے مجرم ہوئے ہیں اور یہ جرم من جملہ ان جرائم کے ہے جن کے

سبب سے وہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کے مستحق قرار پائے۔ حواریین کی اس دُعا کے باطن پر غور کیجئے تو محسوس ہوگا کہ اس میں یہود کی اس حق پوشی پر بالواسطہ تعریض بھی ہے۔

اس آیت کا مضمون تھوڑے سے تغیرِ الفاظ کے ساتھ سورہ صف میں بھی بیان ہوا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ۔ (۱۴)

اے ایمان والو، اللہ کے مددگار بن جاؤ، جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنتا ہے؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ تو بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کیا، پس ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابل میں مدد کی تو وہ ان پر غالب ہو گئے۔

یہاں یہ بات ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اللہ کی مدد سے مراد اللہ کے رسول اور اللہ کے اس دین کی تائید و حمایت ہے جس کو قائم کرنے کی دعوت لے کر اللہ کا رسول اٹھتا ہے۔ 'مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ' کے الفاظ سے خود اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی امداد سے بے نیاز ہونے کے باوجود اس کو اپنی امداد سے جو تعبیر فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام اللہ کو پسند ہے اور اس میں اس کے بندوں کی فلاح و بہبود ہے۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ ۵۴

'مکر' کے معنی ہیں کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے کوئی مخفی تدبیر کرنا۔ اس میں مذمت کا پہلو یہاں سے پیدا ہوا کہ مخفی تدابیر کا استعمال آدمی کی کمزوری کی دلیل ہے۔ چونکہ عام طور پر مشاہدہ یہی ہوتا ہے کہ خفیہ تدبیریں کمزور لوگ ہی استعمال کرتے ہیں اس وجہ سے اس کی مذمت کا پہلو ذہنوں پر غالب ہو گیا، اور یہ گمان کیا جانے لگا کہ مکر لازماً مذموم ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ خفیہ تدبیر بعض حالات میں کسی مکر کرنے والے کے مکر کے توڑ یا اس کی سزا کے طور پر بھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ ایک خفیہ چالیں چلنے والے کے خلاف اگر کوئی علانیہ انتقامی

کارروائی کی جاتی ہے تو وہ اس کو ظلم و زیادتی قرار دے گا اور حالات سے ناواقف اس کو حق بجانب ٹھہرائیں گے۔ اسی طرح کوئی مخفی تدبیر کسی سازشی دشمن کے خلاف بعض اوقات اس کو متنبہ کرنے کے لئے اختیار کرنی پڑتی ہے تاکہ اس پر یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی سازشیں مخفی نہیں ہیں، جن کے لئے وہ یہ جال بن رہا ہے وہ اس کے اس جال سے واقف ہیں۔ یہ چیز اس کو رسوا بھی کرتی ہے اور آئندہ کے لئے اس کو ایسی حرکتوں سے باز رکھنے میں بھی مددگار ہوتی ہے بشرطیکہ اس کے اندر سبق حاصل کرنے کی صلاحیت ہو۔ یہاں جس مکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اس سے مراد یہی مکر ہے جو حق کے دشمنوں کی سازشوں کے توڑ یا ان کی سرکوبی کے لئے اللہ تعالیٰ اختیار فرماتا ہے۔ یہ تدبیریں ایسی تیر بہدف ہوتی ہیں کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور ساتھ ہی ان سے خلق کو بے شمار برکتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیحؑ کو یہود کے شر سے بچانے کے لئے کیا تدبیر اختیار فرمائی تو اس کے جواب کے لئے موزوں موقع سورہ نساء میں آئے گا۔

حضرات انبیاء کی زندگی کی ایک مشترک حقیقت

اس آیت میں جس بات کی طرف اشارہ ہے وہ تمام انبیاء علیہم السلام کی زندگی کی ایک مشترک حقیقت ہے۔ تمام انبیاء کی زندگی شہادت دیتی ہے کہ جب انہوں نے اپنی قوم کے اعیان و اکابر سے مایوس ہو کر اپنی پوری توجہ اپنے غریب ساتھیوں اور قوم کے عام لوگوں پر مرکوز کی ہے اور ان کی دعوت ان لوگوں کے اندر اپنے اثرات پھیلانے لگی ہے تو یہ اعیان و اکابر اس چیز کو اپنے اقتدار کے لئے ایک شدید خطرہ سمجھ کر نبی کے خلاف مختلف قسم کی سازشوں میں مصروف ہو گئے ہیں تاکہ اس کے قتل کا کوئی بہانہ پیدا کر کے اپنے خیال کے مطابق اس مصیبت سے پیچھا چھڑائیں۔

سیدنا مسیح کے خلاف یہود کی سازشیں

یہ مرحلۂ آزمائش یوں تو ہر نبی کی زندگی میں، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، پیش آیا ہے لیکن ہم یہاں سیدنا مسیحؑ سے متعلق یہود کے اعیان و اکابر کی بعض سازشوں کا ذکر کرتے ہیں۔ انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے علماء اور ان کے کاہنوں اور فقیہوں نے اس موقع پر آنحضرتؐ کے خلاف مختلف قسم کے جال بچھائے۔

ایک تو انہوں نے آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر اسلاف کی روایات توڑنے اور بزرگوں کی توہین و تحقیر کا الزام لگایا تاکہ عوام کے جذبات اُن کے خلاف بھڑکائے جاسکیں۔

دُوسرا چال انہوں نے یہ چلایا کہ آپنے مخصوص آدمی بھیج بھیج کر ان سے ایسے سوالات کیئے جن کے جوابوں سے ان کے خلاف کفر و ارتداد کے فتوے کا مواد فراہم ہوسکے۔ یہ کام یہود کے فقیہوں اور فریسیوں نے بڑی سرگرمی سے انجام دیا اور سیدنا مسیحؑ کی تمثیلوں اور تشبیہوں کے اندر سے انہوں نے اپنی دانست میں وہ مواد فراہم کرلیا جس کی بنیاد پر ان کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دیا جاسکے۔

تیسرا یہ کہ اس زمانے میں چونکہ ملک پر سیاسی اقتدار رومیوں کا تھا اس وجہ سے ان کو بھڑکانے کے لئے مواد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلے تو خراج کی ادائیگی سے متعلق آنحضرتؑ سے سوالات کئے گئے جن سے یہ ثابت ہوسکے کہ یہ شخص لوگوں کو قیصر کو خراج دینے سے روکتا ہے۔ لیکن اس قسم کے سوالوں کے جواب سیدنا مسیحؑ نے ایسے دندان شکن دیئے کہ علمائے یہود اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ پھر انہوں نے یہ الزام لگایا کہ یہ شخص اسرائیل کا بادشاہ ہونے کا مدعی ہے۔ اس کے لئے حضرت مسیحؑ کے بعض تمثیلی اقوال سے مواد حاصل کرنے اور اس کے ذریعہ سے رومی حکومت کو بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔

چوتھی تدبیر یہ کی گئی کہ سیدنا مسیحؑ کے بارہ شاگردوں میں سے ایک شاگرد یہودا کو، جو منافق تھا، یہود نے رشوت دے کر اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ آنحضرتؑ کی مخبری کرے اور ان کو گرفتار کرائے۔

ان تمام سازشوں کی تفصیل انجیلوں میں موجود ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہ سارا مواد ایک مناسب ترتیب کے ساتھ یہاں جمع کر دیتے لیکن بہتر یہی معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن نے صرف اشارے پر اکتفا کیا ہے اسی طرح ہم بھی اشارات ہی پر کفایت کریں۔

پیغمبر کی زندگی کا یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں وہ قوم کو چھوڑ کر اور اپنے دشمنوں سے اعلان براءت کر کے ہجرت کرتا ہے اور یہ ہجرت مختلف شکلوں میں جن کی تفصیل اپنے مقام میں آئے گی، ظاہر ہوتی ہے۔

مقالات

از مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

قرآن مجید کی اثر انگیزی

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو عربوں کی زبان میں نازل کیا تھا اور عربوں کو اپنی قدرت کلام، فصاحت و بلاغت، زور بیان، زباندانی اور طاقت لسانی پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنے علاوہ ساری دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے لیکن انہی عربوں کے پاس جنکو اپنی خطابت اور لسانی کا بڑا زعم اور گھمنڈ تھا جب قرآن کی آیتیں اُتریں تو وہ دم بخود اور حیرت زدہ ہوگئے اور اس کے زورِ بیان اور طرزِ کلام کو دیکھ کر اپنے آپ کو عاجز اور درماندہ تصور کرنے لگے اور اس کی بلاغت و فصاحت کے سامنے اپنی فصاحت و بلاغت کو حقیر و بے مایہ سمجھنے لگے اور جب انہی عربوں کو جو اپنے کو سب سے بڑا زبان دان اور ساری دنیا کو گونگا کہتے تھے قرآن مجید نے یہ چیلنج کیا کہ اس کے جیسی کوئی ایک سورہ یا دس آیتیں یا ایک ہی آیت پیش کردو تو تمہاری لسانی کے کرتب اور زورِ بیان کا کمال تسلیم کرلیا جائے گا مگر وہ اس تحدی کا جواب نہ دے سکے اور کسی بڑے سے بڑے شاعر و خطیب اور اعلیٰ درجہ کے ادیب و انشا پرداز کو بھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ قرآن حکیم جیسا کوئی کلام پیش کرے۔ اور قرآن کے زورِ بیان اور طرزِ کلام سے سب مبہوت اور سب کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔

لبید بن ربیعہ عرب کے بڑے نامور اور ممتاز شاعر تھے یہ اسلام سے بھی مشرف ہوئے، زمانۂ جاہلیت میں جن سات شعراء کے قصائد خانۂ کعبہ میں آویزاں تھے، ان میں ان کا بھی ایک قصیدہ تھا، ان کی بلند پائیگی اور شاعرانہ کمال کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اموی دور کے مشہور اور عظیم شاعر فرزدق کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے ایک شعر

وجلا السیول عن الطلول کانها   زبر تجد متونها اقلامها

(ترجمہ) سیلاب نے ٹیلوں کو لکھے جانے والے کاغذ کی طرح صاف شفاف بنا دیا ہے۔

کو سنکر سجدہ ریز ہو گیا تھا[1] لیکن، بیسا باکمال اور بلند پایہ شاعر بھی قرآن کے زور واثر دیکھ کر اس درجہ مبہوت اور مسحور ہوا کہ اس کے بعد اُس نے شاعری ہی ترک کر دی امیر المؤمنین حضرت عمرؓ بن خطاب نے ایک دفعہ ان سے شعر پڑھنے کے لئے کہا تو انہوں نے جواب دیا، جب خدا نے ہمیں بقرہ اور آل عمران سکھا دیا ہے تو پھر شعر کہنا ہم کو زیب نہیں دیتا[2]۔

لبید بن ربیعہ نے زمانۂ جاہلیت میں قسم کھائی تھی کہ اگر پروا ہوا چلے گی تو اونٹ ذبح کر کے احباب کی دعوت کریں گے، اسلام لانے کے بعد یہ صورت پیش آئی مگر اس وقت ان کے پاس نہ تو اونٹ تھے اور نہ اُن کو خریدنے کے لئے رقم۔ ولید بن عقبہ کو جو حضرت عثمانؓ کی جانب سے کوفہ کے گورنر تھے معلوم ہوا تو ان کے یہاں دس اونٹ بھجوائے اور چند شعر کہنے کی فرمائش کی، حضرت لبید نے اونٹوں کو تو ذبح کر ڈالا لیکن شعر گوئی ترک کر چکے تھے اس لئے اپنی لڑکی سے شعر کہنے اور شکریہ ادا کرنے کے لئے کہا۔ اس نے جواب لکھ کر ان کو دکھلایا تو انہوں نے پسند کیا مگر آخری شعر

فعد ان الکریم لہ معاد   وظنی یا ابن اروی ان نعودا

ترجمہ: آپ دوبارہ بھی اسی طرح سخاوت کیجئے اور ہم کو ہدیہ بھیجئے کیونکہ شریف آدمی بار بار ہدیے کرتا ہے اور اے ابن اروی میرا خیال ہے کہ آپ دوبارہ اپنی فیاضیوں سے ہم کو محروم نہ رکھیں گے۔

میں چونکہ مزید طلب اور بخشش کی تمنا ظاہر کی گئی تھی اس لئے انہوں نے کہا مزید طلب کرنے کی ضرورت نہ تھی، لڑکی نے جواب دیا امیر و حاکم سے مزید طلب کرنے میں کوئی حرج نہیں، وہ عام لوگوں میں ہوتا تو میں مزید کی درخواست نہ کرتی[3]۔

مولینا شبلی نے خواجہ حافظ کے کمالات اور ان کی شاعری کی عظمت و اثر انگیزی کا

---

[1] طبقات الشعراء لابن قتیبہ ص ۱۴۸، [2] استیعاب لابن عبد البر ج ص ۲۳۵

[3] طبقات الشعراء ص ۱۴۹

تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"خواجہ حافظ کے بعد اصول ارتقاء کے خلاف غزلیہ شاعری کی ترقی ڈیڑھ سو برس تک رک گئی جس طرح قرآن مجید کے نازل ہونے کے بعد شعراء کی زبانیں بند ہوگئیں "[1]

یہ قرآن کی عظمت و بلند پائیگی اور اس کا غیر معمولی اعجازانہ واثر ہی تھا کہ سخت سے سخت دل بھی نرم ہوگئے اور وادیٔ ظلمات میں بھٹکنے والوں کو سراج منیر مل گیا، اور نہایت قلیل عرصہ میں اسلام کا مہر درخشاں عرب کی افق سے آگے بڑھ کر دوسرے خطوں اور ملکوں کے مطالع پر ضوفشانی کرنے لگا اور چشم زدن میں لوگ فوج در فوج حلقہ بگوش اسلام ہوگئے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی شوکت و قوت سے مرعوب ہو کر لوگوں نے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق فاضلہ اور اعلیٰ سیرت و کردار نے متنفر اور بیزار طبیعتوں کو مائل و متوجہ کر لیا۔ قرآن مجید نے غیب کے متعلق جو خبریں دیں اور پیشگوئیاں کیں جب وہ صحیح ثابت ہونے لگیں تو اس کے باعث لوگ اسلام کی صداقت قبول کرنے پر مجبور ہو گئے علی ہذا القیاس اسلام کی ہمہ گیر اور جامع دعوت، اعلیٰ تعلیم اور ابدی اصول و قوانین نے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا۔ یہ سب صحیح ہے لیکن غور کیجئے ابتداءً نہ تو اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت کا لوگوں کو تجربہ ہوا تھا اور نہ اخبار غیب کے درست اور صحیح ثابت ہونے کا اور اس وقت اسلام کی قوت و شوکت سے مرعوب ہونے کا کوئی سوال نہ تھا، البتہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت و کردار، دیانت وامانت اور صدق وعفاف وغیرہ کا ضرور تجربہ تھا، لیکن یاد ہوگا کہ صفا پر جب آپ نے اپنے اخلاق فاضلہ کا حوالہ دے کر لوگوں کو حق و توحید کی دعوت دی تو وہ کتنے لوگوں کو اپیل کر سکی، بعضوں نے تو اس وقت یہاں تک کہہ دیا تھا،

تَبًّا لَكَ أَلِهٰذَا دَعَوْتَنَا (تمہارا ستیاناس ہو کیا اسی لئے ہم کو بلایا تھا)۔

پس یہ قرآن کی بلاغت و تاثیر تھی جس نے صدیوں کے پرانے باطل اور لغو خیالات و عقائد کو تھوڑی مدت میں تبدیل کر دیا۔ تاریک اور مردہ دلوں کو روشن اور شاداب بنا دیا۔ وادیٔ ظلمات میں بھٹکنے والوں کو راہ ہدایت وسعادت پر گامزن کر دیا خود مشرکین عرب

[1] شعر العجم جلد پنجم ص ۵۸

بھی جو اپنی عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اسلام کی صداقت آشکارا ہونے کے باوجود بھی اپنے باپ دادا کے دین سے چمٹے رہے قرآن کے اثر ونفوذ کے پوری طرح معترف تھے اور اس کی غیر معمولی تاثیر ہی کیوجہ سے اس کو سحر، شعبدہ اور شعر اور آنحضور صلعم کو ساحر، کاہن اور شاعر کہتے تھے، قرآن مجید میں متعدد مواقع پر ان کے اُن اقوال و آثار کو نقل کر کے ان کی تردید کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی اثر آفرینی بالکل مکمل ہے دوسرے سحر و شعر وغیرہ کہکر وہ کلام الٰہی کو لوگوں کی نگاہ میں بے وقعت بنانا چاہتے تھے تاکہ لوگ اس کی طرف کوئی دھیان اور توجہ نہ دیں کیونکہ انہیں قرآن کے اعجاز واثر پر پورا یقین تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ جس نے ایمانداری اور غیر جانبداری کے ساتھ اس کو سنا وہ اُس کی دعوت کو قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا اسی لئے وہ اپنے حدِ امکان بھر عام لوگوں کو قرآن سننے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے :-

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (حٰم السجدہ ۲۶)

اور کافروں نے کہا تم لوگ اس قرآن کو نہ سنو اور جب یہ پڑھا جائے تو بک بک کرو تاکہ تم غالب آسکو۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ مشرکین عرب قرآن حکیم کو سحر و شعبدہ صرف اس کو بے وزن اور کمتر ثابت کرنے کے لئے کہتے تھے اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وہ اس کو واقعۃً کہانت، سحر اور شعر ہی سمجھتے تھے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت جیساکہ جاحظ وغیرہ نے تصریح کی ہے بے شمار بڑے بڑے خطیب و شاعر بھی تھے اور کاہن ساحر بھی، لیکن کیوں کسی کو یہ مجال اور جرأت نہ ہوئی کہ قرآن کا چیلنج قبول کرتا اور اس کے جیسی ایک آیت بھی پیش کر کے دکھا دیتا۔

معلوم ہوا کہ قرآن کے اثرات بڑے دور رس اور نتیجہ خیز ہوتے تھے اور عام ذہنوں اور سادہ طبیعتوں کے سامنے جب اس کی آواز گونجتی تھی تو وہ ان میں جگہ پیدا کئے بغیر نہیں رہتی تھی، ذیل میں ہم تاریخ و سیر اور حدیث کی کتابوں سے کچھ ایسے واقعات نقل کرتے ہیں جن سے قرآن کے کمال تاثیر کا پورا اندازہ ہو جائے گا۔ باقی اسباب تاثیر وجوہ اعجاز

اور اسرار بلاغت سے تعرض کرنے کا یہ محل نہیں ہے قدیم علماء اور موجودہ زمانہ کے بعض مصنفین نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور اگر ضرورت ہوئی تو انشاء اللہ آئندہ اس پہ بھی لکھا جائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت حق بلند کی اور اسلام کی باقاعدہ تبلیغ شروع کی تو کفار قریش نے آپ اور آپ کے رفقاء کے ساتھ جو ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک کیا اس کو دیکھ کر جنگل کے وحوش و بہائم بھی شرما گئے ہوں گے۔ دوستوں اور خیر خواہوں نے بھی سمجھایا کہ خواہ مخواہ اپنی جان جوکھم میں ڈالنے اور خطرات مول لینے سے کیا فائدہ؟ لیکن آپ پر جو حقیقت منکشف ہو چکی تھی اور قرآن کی بتائی ہوئی راہ ہدایت سے دستکش ہو جانا کسی حال میں بھی گوارا نہ تھا، کیا یہ قرآن کی اثر انگیزیوں کا کرشمہ نہ تھا کہ ہزارہا مخالفتوں اور شدید ترین مصائب و محن سے گھبرا کر ایک لحظہ کے لئے بھی راہ حق سے منہ موڑ لینے کا دل میں خیال نہ گزرا۔ غور کیجئے جب ابو طالب جیسا شفیق و غمگسار چچا بھی جوش محبت میں سرشار ہو کر نہایت الحاح کے ساتھ دین حق کی دعوت و تبلیغ سے منع کرتا ہے تو آپ ان کو اس کا کیا جواب دیتے ہیں؟ یہی نا کہ عم محترم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے میں سورج بھی رکھدیں تو میں اپنی دعوت و تبلیغ اور فریضہ حق کی ادائیگی سے دستبردار نہ ہوں گا۔

قریش حیران تھے کہ آخر آپ اسقدر سختیاں کیوں جھیل رہے ہیں کیا وہ وجوہ اور اسباب اور ایسی کیا کشش ہے جس کے لئے ساری اذیتیں اور تکلیفیں گوارا ہیں لیکن دعوت قرآنی سے انحراف گوارا نہیں، ظاہر ہے عام انسانی ذہن و طبیعت ایسی سخت جانفشانی و جانبازی اور اتنی غیر معمولی ریاضت و نفس کشی کا سبب و مقصد جاہ و دولت کی طلب، عزت و ریاست کی آرزو، نام و نمود کی خواہش اور شہوت و ہوس رانی کی تکمیل کے علاوہ اور کن چیزوں کو قرار دے سکتی ہے چنانچہ مشرکین مکہ اور کفار قریش نے بھی یہی سمجھا اور عتبہ بن ربیعہ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے "محمد کیا چاہتے ہو؟ مکہ کی ریاست، قریش کی سیادت، کسی بڑے گھرانے کی حسین و جمیل

حکومت ہے شادی؟ یا مال و دولت کا ذخیرہ تم کو مطلوب ہے؟ ہم لوگ یہ سب کچھ تمہارے لئے مہیا کر سکتے ہیں، تم کو اپنا سردار بنانے کے لئے بھی تیار ہیں اور ہم کو یہ بھی منظور ہے کہ سارا مکہ تمہارے زیر فرمان ہو جائے۔ لیکن خدا کے لئے اپنی ان باتوں کو ترک کر دو۔" عتبہ کو یقین تھا کہ اس کی درخواست مسترد نہ ہو گی اور قریش میں اس کی مقبولیت و اعزاز کا ایک بڑا سبب ان ہاتھ آ گیا مگر اس کو کیا معلوم سرورِ کائنات کی عظمت و شان اس سے کتنی بالا ہے؟ اور اس نے مقام رسالت و منصب نبوت کی کتنی شدید گستاخی کی ہے

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ!

عتبہ کی ترغیبات کے جواب میں آپ نے قرآن مجید کی یہ آیتیں تلاوت کیں:-

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ، قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (حٰمٓ السجدہ ۵ تا ۹)	تم کہدو کہ میں تمہاری ہی طرح کا ایک آدمی ہوں (البتہ) میری جانب اس بات کی وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خداوند ایک ہے اس لئے سیدھے اسی کی طرف رُخ کرو اور اس سے مغفرت چاہو اور خرابی ہے مشرکوں کے لئے جو زکوۃ نہیں دیتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے کبھی نہ ختم ہونے والا بدلہ ہو گا، تم کہو کہ کیا تم لوگ اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا اور تم اُس کے شرکاء ٹھہراتے ہو وہ تو تمام عالم کا خداوند ہے۔

عتبہ پر ان آیتوں کا یہ اثر ہوا کہ قریش کو جا کر سمجھانے لگا کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے، میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ

ہو اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آگئے تو یہ تمہاری عزت ہی کا سامان ہوگا ورنہ عرب خود اس کو فنا کر دے گا۔[1]

یہ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی سے قرآن کی اثر انگیزی کا ثبوت ہے کہ ہزاروں مخالفتوں کے باوجود یہ اس کی عجیب تاثیر اور حیرت انگیز کشش تھی کہ آپ اس کی تبلیغ و تلقین ترک کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوتے۔ لیکن دوسری جانب قرآن سننے اور اس کے پڑھے جانے سے بھی آپ شدید طور پر متاثر ہوتے تھے صحابہ سے قرآن سنانے کی خواہش کرتے اور جب کوئی سناتا تو لطف، لذت اور محویت کی عجیب کیفیت آپ پر طاری ہو جاتی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (اور بعض روایتوں کے مطابق عمرو بن مرۃ) سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو قرآن سناؤ، انہوں نے عرض کیا آپ پر تو قرآن نازل ہوتا ہے، ہم آپ کے سامنے قرآن مجید کیا پڑھیں؟ ارشاد ہوا میں اسے دوسروں سے سننا پسند کرتا ہوں چنانچہ انہوں نے سورۂ نساء کی آیت :-

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا (نساء ۴۱)

پس اس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر امت کے اندر سے ایک شہید لائیں گے اور تم کو ان لوگوں پر شہید بنائیں گے

تلاوت کی تو آپ نے فرمایا رک جاؤ اور اس وقت آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سلسلہ جاری تھا۔[2]

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کے بارہ میں کہا ہے۔

رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي الخ (ابراهیم ۳۶)

خداوندا ان بتوں نے اکثر لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے، پس جس نے میری متابعت کی وہ مجھ سے ہوگا۔

اور حضرت مسیحؑ کا قول ہے کہ

[1] سیرت النبی جلد اول ص ۲۲۳ [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۵۹

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (مائدہ ۱۱۸)

اگر تو اُن کو عذاب دے گا تو یہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر معاف کرے گا تو بیشک تو عزت و حکمت والا ہے۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیتیں تلاوت کیں تو آپ پر عجیب تاثر ہوا اور آپ اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر اَللّٰهُمَّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ کہنے اور رونے لگے [۱]

ان واقعات اور آپ کی عملی زندگی سے یہ بات اچھی طرح عیاں ہو گئی کہ خود رسول کریمؐ پر قرآن حکیم کا کیسا گہرا اثر تھا۔

حاکم کی مستدرک سے علامہ سیوطی حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"ولید بن مغیرہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا تو آپ نے اس کو قرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر سنایا، اس سے اس پر رقت طاری ہوئی مگر جب ابوجہل کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے کہا چچا جان! آپ کی قوم آپ کو مال و دولت کا ذخیرہ دینا چاہتی ہے تاکہ آپ محمدؐ کے پاس جا کر اُن کی باتیں نہ سُنیں، ولید نے کہا قریش کو معلوم نہیں کہ میں ان میں سب سے زیادہ دولت مند ہوں، ابوجہل نے کہا تو پھر محمدؐ کے متعلق ایسی باتیں کہئے جن سے قریش کو یقین ہو جائے کہ آپ کو ان سے نفرت و بیزاری ہے ولید نے کہا مجھ سے زیادہ شعر و سخن کا ماہر اور نقاد کون ہو سکتا ہے مگر خدائے ذوالجلال کی قسم ہم لوگ اس کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں بالکل غلط ہے، اس کے کلام کو شعر و سحر سے کوئی تعلق نہیں، اس میں حلاوت و شیرینی ہے، اور وہ مفید و بارآور اور غالب آنے والا ہے، اس پر غالب نہیں ہوا جا سکتا، وہ دوسروں کو پاش پاش کر ڈالے گا، ابوجہل نے کہا آپ کی قوم کبھی ان باتوں کو پسند نہیں کر سکتی اور نہ وہ آپ سے خوش ہو سکتی ہے، ولید نے کہا اچھا مجھے سوچ بچار کرنے کا موقع دو۔ چنانچہ اس نے غور و فکر کے بعد کہا هٰذَا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ (یہ ایسا جادو ہے جو پہلے لوگوں سے

---

[۱] صحیح مسلم باب بکاء النبیؐ الامۃ

نقل ہوتا چلا آرہا ہے[1]

قرآن کی اثر انگیزی اور دلکشی کا یہ حال تھا کہ اسے سن کر لوگوں پر ہیبت طاری ہوجاتی تھی اور ان کا دل لرز لرز اٹھتا تھا۔ متعدد لوگ اسی طرح آیاتِ الٰہی سنکر متاثر ہوئے اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا جبیر بن مطعم بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلعم کو مغرب کی نماز میں سورہ طور پڑھتے سنا اور جب آپ نے یہ آیتیں،

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ	کیا وہ لوگ خود بخود بلا کسی چیز کے پیدا ہوگئے
هُمُ الْخَالِقُوْنَ ۔ اَمْ خَلَقُوا	ہیں یا وہی پیدا کرنے والے ہیں، یا انھوں نے
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا	آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (نہیں یہ سب
يُوْقِنُوْنَ ۔ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ	کچھ نہیں) حقیقت یہ ہے کہ وہ یقین نہیں رکھتے
رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ۔	کیا ان کے پاس تیرے خداوند کے خزانے
(طور ۳۵ تا ۳۷)	ہیں یا وہی داروغہ ہیں۔

تلاوت کیں تو میرا دل دھڑکنے لگا اور اس کی عجیب کیفیت ہوگئی[2] اور یہی وہ پہلا موقع تھا جب اسلام کی عظمت و تاثیر میرے دل میں راسخ ہوگئی[3]

دعوت نبوی کا پانچواں سال تھا اور مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جارہے تھے اور مشرکین کی تکلیف و ایذاء رسانی روز بروز شدت اختیار کرتی جارہی تھی اس لئے مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کا حکم ملا۔ تاکہ وہاں کے رحمدل اور منصف مزاج عیسائی بادشاہ نجاشی کی سلطنت میں کچھ مسلمان امن و اطمینان کی زندگی گذار سکیں۔ لیکن مشرکین مسلمانوں کے آرام و آسائش کو کب گوارا کرسکتے تھے۔ انھوں نے اپنا ایک وفد ہدایا اور تحائف کے ساتھ نجاشی کے پاس بھیجا تاکہ مسلمانوں کے خلاف اسکو برافروختہ کردیں اور وہ ان مظلوموں کو ان کے حوالہ کردے لیکن نجاشی اس کے لئے کسی طرح آمادہ نہ ہوا اور تحقیق کے لئے اس نے مسلمانوں کو طلب کیا حضرت جعفر رضؓ طیار نے جو اس جماعت کے قائد تھے ایک پراثر تقریر کی جس سے نجاشی بہت متاثر ہوا، اس کے بعد اس نے کہا اچھا تمہارے نبی پر جو کلام

[1] الاتقان ج ۲ ص ۱۱۸، [2] صحیح بخاری ج ۲ تفسیر سورۂ طور [3] اتقان ج ۲ ص ۱۳۳

اترتا ہے اس میں سے اگر کوئی حصہ یاد ہو تو ہم کو بھی سناؤ، حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی کچھ آیتیں سنائیں جن کو سن کر نجاشی اور اس کے درباری اس قدر زار و قطار روئے کہ ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں پھر اس نے کہا کہ یہ اور حضرت مسیحؑ کا دین ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں اور کفار سے کہا تم لوگ جاؤ میں انہیں تمہارے حوالہ نہیں کر سکتا۔[1]

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید کا قرب و جوار میں چرچا ہوا تو قبیلہ غفار کے حضرت ابوذرؓ نے اپنے بھائی انیسؓ کو مکہ بھیجا تاکہ اس نبی کے متعلق صحیح معلومات حاصل کریں، انہوں نے آنحضورؐ کی باتیں سنیں تو اپنے بھائی کو آکر بتایا کہ وہ تو نہایت عمدہ باتوں کی تعلیم دیتا ہے اور جو کچھ خدا کا کلام سناتا ہے بخدا وہ شعر و کہانت نہیں، میں خود شاعر ہوں اور میں نے اس کی باتیں شعر کے اوزان پر پرکھیں مگر محمد نہ شاعر ہیں اور نہ ان کے کلام کو شعر کہا جا سکتا ہے۔[2]

اس کے بعد حضرت ابوذر کا اشتیاق اور بڑھا اور وہ خود مکہ تشریف لے گئے اور وہاں کلام الٰہی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسلام قبول کر کے واپس آئے۔

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ ازد کے ایک شخص ضمادؓ جو جھاڑ پھونک کرتے تھے مکہ آئے، یہاں انہوں نے لوگوں سے سنا کہ محمدؐ دیوانہ ہیں انہوں نے سوچا کہ اگر میری ان سے ملاقات ہو جائے تو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں شفاء دیدے گا۔ اس لئے وہ آپ سے ملنے آئے اور کہا محمدؐ میں جھاڑ پھونک کا کام کرتا ہوں اور جسے اللہ چاہتا ہے میری بدولت اس کو شفاء ہو جاتی ہے، اگر تم چاہو تو میں جھاڑ پھونک کر دوں۔ آپؐ نے ان کے سامنے خدا کی حمد و ثناء بیان کی اور پھر کلام مجید کی کچھ آیتیں پڑھیں، ضماد پر ان کا اتنا اثر ہوا کہ وہ کہنے لگے کہ میں نے کاہنوں، ساحروں اور شاعروں کی باتیں سنی ہیں لیکن تمہارے کلام کو ان سے کوئی واسطہ نہیں، اس کا اثر تو سمندروں پر بھی ہو سکتا ہے پھر انہوں نے اسلام لانے کی خواہش ظاہر کی اور مسلمان ہو گئے۔[3]

عبداللہ بن عباس حضرت عثمان بن مظعونؓ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ

---

[1] سیرت ابن ہشام برحاشیہ روض الانف ج ۱ ص ۲۱۳، [2] صحیح مسلم باب فضائل ابی ذر [3] صحیح مسلم کتاب الجمعہ

رسول کریم صلعم کی مجلس میں تشریف فرما تھے کہ حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے ان کے جانے کے بعد رسول اللہ نے عثمان سے فرمایا ابھی تمہاری موجودگی میں حضرت جبرئیل آئے تھے انہوں نے دریافت کیا کہ جبرئیلؑ نے آپ سے کیا کہا آنحضرتؐ نے سورۂ نحل کی یہ آیت پڑھی ۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	بیشک اللہ عدل، احسان اور قرابتداروں
وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتَامٰی وَیَنْھٰی	دینے کا حکم دیتا ہے، اور بے حیائی، منکر
عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ	اور بغی سے روکتا ہے وہ تم کو سمجھاتا ہے تاکہ
لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (نحل ۹۰)	یاد رکھو ۔

عثمان بن مظعون کہتے ہیں یہ سنکر میرے دل میں بڑا اثر ہوا اور قلب میں ایمان راسخ ہو گیا اور میں آنحضرت سے بڑی محبت کرنے لگا[1]

خالد عدوانی نے سفر طائف میں رسول اللہ کو سورۃ طارق پڑھتے سنا تو گو اس وقت اسلام نہیں قبول کیا لیکن کلام الٰہی کی تاثیر دل میں پوری طرح گھر کر گئی اور وہ پوری سورہ ان کو زبانی یاد ہوگئی[2]

طفیل بن عمر دوسی جو اپنے قبیلہ کے سردار بڑے زیرک اور اچھے شاعر تھے خود اپنے اسلام لانے کا حال بیان کرتے ہیں کہ مجھے مکہ آنے اور قریش کے کچھ لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان لوگوں نے کہا طفیل تم شاعر بھی ہو اور اپنی قوم کے رئیس و مطاع بھی، ہم کو خطرہ ہے کہ اگر تمہاری اس شخص سے ملاقات ہوگئی اور اس کی کوئی بات تم نے سن لی تو وہ سحر کی طرح تمہارے دل پر اثر انداز ہو جائیں گے ۔ اس لئے تم خوب چوکنے اور ہوشیار رہو ورنہ ہم لوگ جس چیز میں مبتلا ہیں اسی میں وہ تم کو اور تمہاری قوم کو بھی مبتلا کر دے گا یہ شخص مرد و زن اور باپ بیٹوں میں جدائی پیدا کر دیتا ہے طفیل کہتے ہیں کہ اسی طرح وہ لوگ برابر اصرار کے ساتھ منع کرتے رہے اور میں نے بھی طے کر لیا کہ مسجد میں کان بند کر کے داخل ہوں گا چنانچہ میں اپنے کانوں میں روئی ٹھونس کر مسجد میں گیا، وہاں رسول اللہ کھڑے نظر آئے میں بھی آپ کے قریب کھڑا ہو گیا اللہ کو سنانا منظور تھا آپ نماز میں قرآن مجید پڑھ رہے تھے میں نے اپنے جی میں کہا یہ آدمی تو بڑا شاندار

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۳۱۸، [2] ایضاً ج ۴ ص ۳۳۵

معلوم ہوتا ہے اور بخدا مجھے اپنے اوپر پورا اعتماد اور اطمینان تھا کہ کسی چیز کا حسن و قبح مجھ سے مخفی نہ رہے گا۔ اس لئے میں نے طے کیا اس کی بات ضرور سنوں گا اگر درست معلوم ہوئی تو قبول کر لوں گا اور اگر وہ ٹھیک نہ ہوگی تو اس سے اجتناب کروں گا، اب میں نے اپنے کانوں کی روئی نکال دی اور آپ کی باتیں توجہ سے سننے لگا واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہتر کلام، دلکش انداز اور خوبتر الفاظ میں نے کبھی نہ سنے تھے، اس کے بعد میں آپ کا انتظار کرتا رہا، جب آپ اپنے گھر تشریف لے چلے تو میں بھی آپ کے ہمراہ ہو گیا اور گھر پہنچنے کے بعد میں نے عرض کیا آپ کی قوم مجھ سے اس اس طرح کہہ رہی تھی اور اس نے شدت کے ساتھ آپ کی باتیں سننے سے منع کیا تھا لیکن خداوند قدوس کو سنانا منظور تھا، اس کو سننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آپ جو کچھ فرماتے اور پیش کرتے ہیں وہ بالکل سچ ہے اس لئے آپ میرے سامنے اپنا دین پیش کیجئے۔ چنانچہ آپ نے پیش کیا اور قرآن کی تلاوت کی خدا شاہد ہے کہ اس سے بہتر اور برتر کلام میں نے کبھی نہ سنا تھا اس لئے میں مسلمان ہو گیا اور آپ سے عرض کیا کہ میں اپنے قبیلہ کا سردار ہوں ان کو بھی اسلام کی دعوت دوں گا۔[1]

ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ بیان کرتی ہیں کہ جو مسلمان حبشہ کی ہجرت کے لئے روانہ ہو رہے تھے ان میں میرے والد حضرت ابوبکر بھی تھے مگر وہ مکہ سے دو یا ایک دن کی مسافت طے کر سکے تھے کہ راہ میں ابن الدغنہ سے ملاقات ہو گئی، انہوں نے دریافت کیا ابوبکر کہاں کا قصد ہے، جواب دیا ہماری قوم نے ہم کو نکال دیا ہے، طرح طرح کی تکلیفیں دیتی ہے۔ ابن الدغنہ نے کہا آخر تم جیسے آدمی کے ساتھ یہ سلوک کیا جا رہا ہے تم تو بہت خوب آدمی ہو اور غریبوں اور ضرورت مندوں کے کام آتے ہو، نیک کام کرتے ہو، اس لئے واپس چلو تم میری پناہ میں رہو گے چنانچہ واپس لوٹ آئے اور جب مکہ پہنچے تو ابن الدغنہ نے قریش سے کہا میں نے ابو قحافہ کو پناہ دی ہے اس لئے کوئی انہیں تنگ نہ کرے، انہوں نے کہا تم نے ایسے آدمی کو امان دی ہے جو ہمیں تکلیفیں دیتا ہے، اس شخص نے ایک چھوٹی مسجد بنائی ہے اور اس میں جب نماز پڑھتا اور تلاوت قرآن کرتا ہے تو اس پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور

[1] استیعاب لابن عبدالبر ۲ ؍ ۱ ص ۲۱۸، نیز اسد الغابہ اور سیرت ابن ہشام میں بھی یہ واقعہ ملتا ہے۔

وہ رونے لگتا ہے، یہ دیکھ کر ہمارے بچے اور عورتیں اکٹھا ہو جاتی اور قرآن سے متاثر ہوتی ہیں[1]

حبش سے تقریباً ۲۰ عیسائی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اطلاع پا کر مکہ آئے، انھوں نے آپ کو مسجد میں پایا، وہیں آپ کے پاس بیٹھ کر باتیں اور سوالات کئے، جب ان کے سوالات ختم ہوئے تو آپ نے انہیں خدا پرستی کی تلقین کی اور قرآن سنایا۔ وہ لوگ قرآن سنکر زار و قطار روئے اور پھر ایمان لائے اور خدا کی پکار پر لبیک کہا[2]

حج کے موقع پر مختلف قبیلوں اور شہروں کے لوگ اکٹھا ہوتے تو آپ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن سناتے، مدینہ منورہ سے جو لوگ آئے اور جنہوں نے دین حق قبول کیا اور جب کفار قریش کا ظلم وستم حد سے بڑھا تو آپ اور آپ کے اصحاب کو وہیں بلا لیا اس طرح مدینہ آگے چل کر اسلام اور دعوت رسالت کا اولین مرکز بنا لیکن اوّل اوّل حج کے مواقع پر کچھ لوگ قرآن کی اثر آفرینی ہی کی بدولت حلقہ بگوش اسلام ہوتے تھے، ابن ہشام کا بیان ہے کہ آپ نے انہیں قرآن سنایا اور خدائے واحد کی بندگی کی دعوت دی[3]

سعید بن معاذ اور اسید بن حضیر کے سامنے جب مصعب بن عمیرؓ نے اسلام پیش کیا اور قرآن مجید سنایا تو وہ اس کی حقانیت و تاثیر سے اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے[4]

ابو عبیدہ بن حارث، ابو سلمہ بن عبدالاسود، ارقم بن ابی الارقم اور عثمان بن مظعون رسول اللہ کے پاس آئے اور آپ نے ان لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور قرآن پڑھا تو وہ اس سے متاثر ہوئے اور اسلام لائے اور گواہی دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت و بصیرت پر ہیں[5] متعدد لوگوں نے قرآن کی بلاغت کی داد اور اس کے کمال تاثیر کی شہادتیں دی ہیں۔ مثلاً ولید بن مغیرہ کے سامنے جب آپ نے اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى الخ (نحل ۹۰) پڑھی تو اس نے کہا اس کلام میں اہل ذوق کے لئے بڑی حلاوت اور دلآویزی ہے اور یہ بڑا پر رونق اور پر جمال ہے اس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں برگ و بار آور ہیں[6]

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۳۱، [2] ایضاً ص ۲۳۹، [3] ایضاً ص ۴۶۷، [4] ایضاً ص ۲۷۲ [5] اسد الغابہ ج ۵ ص ۲۱۸، [6] شرح الشفاء ج ۲ ص ۵۲۸،

ایک اعرابی نے ایک شخص کو فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (الآیہ)
پڑھتے سُنا تو وہ اس کی بلاغت سے اس قدر مرعوب و متاثر ہوا کہ سجدہ میں گر پڑا۔[له]
ایک اور اعرابی نے فَلَمَّا اسْتَيْأَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا (یوسف : ۸۰) سُنی تو بول اٹھا
کہ اس طرح کا کلام کسی مخلوق کا نہیں ہو سکتا۔[له]

یہ تو چند واقعات ہیں، تاریخ اسلام اور خصوصاً دورِ نبوت کے واقعات کی اگر چھان بین کی جائے تو متعدد اشخاص کے اسلام اور اعتقادِ خداوندی کا اوّلین سبب و باعث قرآن کی تاثیر و بلاغت ہی نظر آئے گی ہم اس سلسلہ کو خلیفۂ ثانی امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب کے واقعہ اسلام پر ختم کرتے ہیں۔ جو بڑا اہم پُرسوز اور پُراثر ہے،

حضرت عمرؓ کے اسلام و ایمان کا خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو انتظار تھا۔ ان کے قبول اسلام سے مسلمانوں کو بڑی تقویت ملی اور اسلام لانے کے بعد ان کو جس درجہ شدید تعلق اس سے ہو گیا تھا اسی درجہ گہرا تعلق اپنے ابائی دین سے بھی تھا چنانچہ جب اس دین کی ان کو خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے یہاں تک کہ رسُول خُدا کی زندگی ہی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دینے کا ارادہ بھی ان کے دل میں آیا۔ مگر مشیّت ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا، چنانچہ کلام ربانی کی چند آیتیں کانوں سے ٹکرائیں تو دفعتہً تمام نقشہ جنگ ہی بدل گیا، محمدؐ کے قتل و ہلاکت کا ناپاک جذبہ ان کی عقیدت و محبت کے پاکیزہ جذبہ میں تبدیل ہو گیا اور وہی تلوار جو محمدؐ کا سر قلم کرنے اٹھی تھی اب ان کے دشمنوں کے قتل کے لئے اُٹھ جاتی ہے۔

کتُبِ سیر میں حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے متعلق کئی روایتیں ملتی ہیں لیکن قرآن کی اثر انگیزی کی حد تک ان سب کا قدرِ مشترک ایک ہی ہے۔ ہم مولینا شبلی کے قلم سے اس واقعہ کو تمام و کمال نقل کرتے ہیں کیونکہ ؎

داستانِ عہدِ گل را از نظیری باز پرس
عندلیب آشفتہ تر گفت است ازیں افسانہ را

(حضرت عمر کا ستائیسواں سال تھا کہ عرب میں آفتاب رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہ

له وله اسد الغابہ ص۵۲۹

مبعوث ہوئے اور اسلام کی صدا بلند ہوئی، حضرت عمر کے گھرانے میں زید کی وجہ سے توحید کی آواز بالکل نامانوس نہیں رہی تھی چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعید اسلام لائے، سعید کا نکاح حضرت عمر کی بہن فاطمہ سے ہوا تھا اس تعلق سے فاطمہ بھی مسلمان ہوگئیں۔ اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیم بن عبداللہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا لیکن حضرت عمر ابھی تک اسلام سے بالکل بیگانہ تھے۔ ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے یہاں تک کہ قبیلے میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے ان کے دشمن بن گئے۔ لبینہ ان کے خاندان میں ایک کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا اس کو بے تحاشا مارتے اور مارنے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ ذرا دم لے لوں تو پھر ماروں گا لبینہ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زدوکوب سے دریغ نہیں کرتے تھے لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اترتا نہ تھا، ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بددل نہ کر سکے، آخر مجبور ہو کر فیصلہ کیا کہ (نعوذ باللہ) خود بانی اسلام کا قصہ پاک کر دیں، تلوار کمر سے لگا سیدھے رسول اللہ کی طرف چلے کارکنان قضا نے کہا ؏

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہ مل گئے ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ بولے کہ "محمدؐ کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں"۔ انہوں نے کہا پہلے اپنے گھر کی خبر لو خود تمہاری بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے وہ قرآن پڑھ رہی تھیں ان کی آہٹ پا کر چپ ہوگئیں اور قرآن کے اجزاء چھپا لئے لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ بہن سے پوچھا کہ یہ کیا آواز تھی؟ بہن نے کہا کچھ نہیں، بولے کہ "نہیں میں سن چکا ہوں کہ تم دونوں مرتد ہوگئے" یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریباں ہوگئے اور جب ان کی بہن بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی، یہاں تک کہ ان کا بدن لہولہان ہوگیا، اسی حالت میں ان کی زبان سے نکلا کہ "عمر! جو بن آئے کرو لیکن اسلام اب دل سے نہیں نکل سکتا"۔ ان الفاظ نے حضرت عمر کے دل پر ایک خاص اثر کیا، بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا، ان کے بدن سے خون جاری تھا یہ دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی فرمایا کہ تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھ کو بھی

سناؤ، فاطمہ نے قرآن کے اجزاء لاکر سامنے رکھ دئے، اُٹھاکر دیکھا تو یہ سورہ تھی سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ، ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ تو بے اختیار پکار اُٹھے کہ اَشْہَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارقم کے مکان میں جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا پناہ گزیں تھے حضرت عمر نے آستانہ مبارک پر پہنچکر دستک دی۔ چونکہ شمشیر بکف گئے تھے اوراس تازہ واقعہ کی کسی کو اطلاع نہ ملی اس لئے صحابہ کو تردد ہوا لیکن حضرت عمر نے اندر قدم رکھا تو رسُول اللہ خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کر فرمایا کیوں عمر! کس ارادے سے آیا ہے؟ نبوّت کی پُر رعب آواز نے اُن کو کپکپا دیا نہایت خضوع کے ساتھ عرض کی کہ" ایمان لانے کے لئے" آنحضرت بے ساختہ اللہ اکبر پکار اُٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ تمام پہاڑیاں گونج اُٹھیں"[1]

قرآن کے حیرت انگیز اثرات سے انسان تو انسان جنات بھی مرعوب و متاثر ہوتے ابن ہشام کا بیان ہے کہ" رسول اکرمؐ جب طائف سے مایوس ہوکر مکہ لوٹ رہے تھے تو ایک شب وادی نخلہ میں نماز پڑھنے کھڑے ہوئے اور تلاوتِ قرآن شروع کی تو جنوں نے اس کو سنکر حیرت انگیز اثر قبول کیا اور بعد میں اپنی قوم کو بھی اس کی دعوت دی، سورۂ احقاف اور سورۂ جن میں اس کی جانب اشارے کئے گئے ہیں۔ سورہ احقاف میں ہے۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْکَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ	اور یاد کرو جب ہم نے تمہاری طرف جنوں کا
یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْہُ	ایک گروہ قرآن سننے کے لئے پھیر دیا جب
قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی	وہ وہاں پہنچے تو باہم کہ بولے کہ چپ چاپ
قَوْمِہِمْ مُّنْذِرِیْنَ قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ اِنَّا	رہو پھر جب ختم ہوا تو وہ اپنی قوم کے پاس
سَمِعْنَا کِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی	لوٹے اور تنبیہ کرنے لگے انہوں نے کہا اے
مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ یَھْدِیْ	ہماری قوم ہم نے ایک کتاب سُنی ہے جو

[1] الفاروق ج اول از صفحہ ۳۱ تا ۳۴ بحوالہ انساب الاشراف بلاذری و طبقات ابن سعد و اسد الغابہ و ابن عساکر و

اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ
يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ
اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ
وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ؕ
(احقاف ۲۹ تا ۳۱)

موسیٰ کے بعد اتاری گئی ہے اور جو اپنے سے پہلے کی کتابوں کے ہو بہو مطابق ہے اور جو حق اور سیدھا راستہ دکھاتی ہے، اے قوم کے لوگو! اللہ کی طرف بلانے والے کا جواب دو اور اس پر ایمان لاؤ تو وہ تمہارے گناہوں کو معاف اور تم کو دردناک عذاب سے بچائے گا۔

ایک جگہ قرآن مجید نے اپنی عظمت و تاثیر کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ
خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ
تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
يَتَفَكَّرُوْنَ (حشر ۲۱)

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو وہ اللہ کے ڈر سے جھکا، دبا اور پاش پاش نظر آتا۔ اور یہ مثالیں ہم لوگوں سے اس لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر کریں۔

کیا ان تفصیلات کے بعد بھی کسی کو قرآن کی اثر انگیزی اور دلکشی میں کوئی کلام ہو سکتا ہے مگر یہ بات بڑی قابل غور ہے کہ جس قرآن کی تاثیر کا یہ حال تھا کہ دفعتہً دلوں کی دنیا بدل جاتی تھی۔ اور کفر و ضلالت پسند طبیعتیں، ایمان و ہدایت سے سرفراز ہو جاتی تھیں اور جس کے ثرات کی یہ کیفیت ہو کہ پہاڑ بھی سنیں تو پاش پاش ہو جائیں مگر آج وہ ایک ذہن و دماغ کو ی اپیل نہیں کر رہا ہے، اوروں کا تو ذکر ہی کیا خود مسلمان جو روزانہ اس کی تلاوت کرنے ہر نمازوں میں اس کو سنتے ہیں (اور اگر اس کی بھی توفیق نہیں ہوتی تو یہ اور زیادہ شرمناک ت ہے) لیکن ان کے دلوں میں سوز و گداز اور طبیعتوں میں جوش و ولولہ نہیں پیدا ہوتا اور نہ ان ، ذلتیں اور پستیاں عظمتوں اور رفعتوں میں تبدیل ہوتی ہیں، حالانکہ قرآن تو تمہیں عزت و عظمت ، بخشنے، امنگ و حوصلہ دینے اور وادیٔ ظلمات سے نکالنے ہی کے لئے آیا تھا۔

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍ
بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ

وہی اللہ ہے جو اپنے بندہ (محمدؐ) پر روشن آیتیں اتارتا ہے تاکہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں کر دے اور لاریب اللہ تم پر

ترجمہ: (حدید ۹) بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

تو کیا خدا کا یہ قانون بدل گیا ہے نہیں وہ تو کہتا ہے لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا

حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور اس کی دعوت حق وسعادت اب بھی اپنے اندر پوری کشش اور جاذبیت رکھتی ہے مگر ہمارے دلوں کی سختی وسنگدلی اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ کوئی اثر ہی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں

طالب لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید
ہمچنیں در عمل معدن وکان ست کہ بود

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو قرآن مجید ٹھیک ٹھیک طور سے پڑھنے اور اس سے خاطر خواہ اخذ واستفادہ کی توفیق عطا فرمائے، کیونکہ اپنا عقیدہ اور ایمان یہ ہے کہ یہ ان کی اصل متاع اور حقیقی دولت ہے، اس سے تہی دامن ہو کر اگر دنیا جہان کی تمام دولتیں بھی ان کو مل جائیں تو وہ فقیر و گدا ہی رہیں گے۔

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے — لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے
